دیوؤں کا سایہ
(افسانوں کا مجموعہ)
ڈاکٹر ریاض توحیدی

معتبر شعر و دانش کے سالک
جناب سلیم سالک صاحب
کی خدمت میں
بصد خلوص

کالے دیوں کا سایہ

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر ریاض توحیدی

ISBN : 978-93-80691-60-2

نام کتاب : کالے دیوؤں کا سایہ

(افسانوں کا مجموعہ)

مصنف : ڈاکٹر ریاض توحیدی

سال اشاعت : ۲۰۱۴ء

چھاپ خانہ : میزان سرویسز

قیمت : ۲۰۰ روپیہ

KALAY DEEWON KA SAYA

Dr. Riyaz Tawhidi

Price: 200/-

Publisher:

Meezan Publishers & Distributors

Opp. Fire & Emergency Services HQRS Batamaloo

Srinagar-190009 Kashmir

Ph. 0194-2470851- Fax.2457215 /

Cell: 9419002212 / 8494002212

Email: meezanpublishers@gmail.com /

@radiffmail.com

نام	:	ڈاکٹر ریاض احمد بٹ
قلمی نام	:	ڈاکٹر ریاض توحیدی
ولدیت	:	غلام احمد بٹ
تعلیم	:	ایم اے (اُردو)، ایم۔فل، پی۔ایچ۔ڈی
ایوارڈ	:	پروفیسر جگن ناتھ آزاد گولڈ میڈل (اقبالیات)
پیشہ	:	لیکچرار، محکمہ تعلیم
ممبر	:	اُردو اکادمی جموں کشمیر
پتہ	:	وڈی پورہ ہندوارہ کشمیر 193221
موبائیل نمبر	:	9906834877
ای میل	:	drreyazbhat@yahoo.in

شائع شدہ تصانیف:۔

۱۔ جہانِ اقبال (اقبالیات) ۲۰۱۰ء

۲۔ کالے پیڑوں کا جنگل (افسانے) ۲۰۱۱ء

۳۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحیثیت اقبال شناس ۲۰۱۳ء

Dr. Reyaz-Tawheedi

Address:-Wadipora-Handwara-kashmir193221(India)

Mobil:-9906834877

email-drreyazbhat@yahoo.in

انتساب

جنت نظیر کی ان کلیوں

کے نام

جن کے گلابی بدن کالے دیوؤں کے آہنی

پنجوں سے ریزہ ریزہ ہوگئے

(اس مجموعے کے سبھی کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی قسم کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی، جس کے لئے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہوگا)

مصنّف

فہرست

پیش لفظ

پروفیسر حامدی کاشمیری

ریاض توحیدی نے تحقیق وتنقید پر سنجیدہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تخلیقی حسیت کا افسانہ نویسی کی صورت میں اظہار کرنا شروع کیا ہے۔ وہ ایک طرح سے مابعد جدیدیت کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے اثرات اردو ادب میں افسانے کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے لیکر جدید دور میں جدیدیت کے ردعمل کے طور پر مابعد جدیدیت کو فروغ ملنے لگا۔ مابعد جدیدیت کوئی فلسفہ یا نظریہ نہیں ہے۔ اس دور میں سانس لینے والے نو واردانِ ادب، اس انسانی صورت حال کا سامنا کرتے ہیں جس میں سیاست، چنگیزیت میں تبدیل ہورہی ہیں۔ چنانچہ مقامی سطح پر اقدار شکنی، خوابوں کی شکست، رومانیت کی نفی کے علاوہ عالمی سطح پر ظلم وتشدد، اغوا کاری، ذاتی مفاد اور ملکی مفاد کے درمیان ٹکراؤ کی جو صورت حال ہے اس کے اثرات موجودہ عہد کے ادیب کے ضمیر اور دل ودماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور اس کا اظہار وہ اپنی تحریر میں کرتا ہے۔

نئی نسل، جس کی نمائندگی ریاض توحیدی کرتے ہیں، گہرے شعور اور فکر ونظر کی تازہ کاری کے اوصاف کی حامل ہیں۔ توحیدی کی انفرادیت اس

بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ ''زہر ہلاہل کو قند'' کی صورت عطا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ بقول علامہ اقبالؔ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

گردو پیش کے ماحول میں لوگوں کو جس ظلم و تشدد سے گزرنا پڑا ہے اس کی تصویریں ریاض توحیدیؔ اپنے افسانوں میں پورے خلوص، دردمندی اور دکھ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان پر حقیقت نگاری کا اسلوب حاوی نہیں، وہ جانتے ہیں کہ فن کے رموز کیا ہیں اور وہ ان کو اچھی طرح لفظوں میں منتقل کرتے ہیں۔ ریاض توحیدیؔ کو زبان و بیان پر پورا عبور حاصل ہے۔ وہ افسانے کے واقعات کو بہت حد تک فرضیت میں مبدل کرتے ہیں اور یہی ان کی افسانہ نگاری کی پہچان ہے۔

کالے دیوؤں کا سایہ

پروفیسر قدوس جاوید
(شعبہ اردو، سنٹرل یونیورسٹی کشمیر)

اُردو میں شعر و ادب کی تخلیق .... دنیا کی نہ جانے کتنی بستیوں میں ہو رہی ہے، لیکن کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف ادب نہیں لکھتے، ادب کے حوالے سے اہم عصری تناظرات Contemporary Context کو جینے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور یہ تو ماننا ہوگا کہ ہر سچا قلم کار اپنے معاشرہ، اپنی ثقافت سے وابستہ رہ کر ہی پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی زمین میں اپنے ادب کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ چنانچہ کشمیر کے ادیب خواہ وہ کشمیری میں لکھتے ہوں یا اُردو میں یا پنجابی، پہاڑی، گوجری اور لداخی کسی بھی زبان میں ان کی شناخت کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ ان کی تحریروں سے کسی نہ کسی زاوئے سے اپنی زمین اور تہذیب کی گنگناہٹ لازمی طور پر سنائی دیتی ہے۔ جب ہم کشمیر میں اُردو افسانہ کے مزاج کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نور شاہ، عمر مجید اور خالد حسین سے لے کر مشتاق مہدی، شیخ عبدالرشید، غلام نبی شاہد، ایثار کشمیری اور ڈاکٹر نیلوفر

نازنحوی قادری تک اور اس کے ساتھ کی نسل کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ریاض توحیدؔی کے افسانوں میں بھی کشمیر کے عصری حالات وحقائق کو عمدہ فنی اور جمالیاتی دروبست کے ساتھ جینے کا عمل ملتا ہے۔ ریاض توحیدؔی کو تحقیق و تنقید سے بھی دلچسپی ہے ۔ اب تک ان کے بیسوں مضامین اور افسانے معیاری رسائل اور نیٹ سائٹوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ریاض توحیدؔی کو اقبالیات سے خصوصی شغف ہے۔ علاّمہ اقبال کے فکر وفن پر ان کی تصنیف ۲۰۱۰ءؔ ''جہانِ اقبالؔ'' کے نام سے شائع ہو کر عوام وخواص سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ مشہور اقبالؔ شناس ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے ریاض توحیدی کا تازہ ترین تحقیقی وتنقیدی کارنامہ ''ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم بحثیت اقبالؔ شناس'' یقینی طور پر اقبالیات کے باب میں ایک اضافے کا حکم رکھتا ہے. ریاض توحیدیؔ تخلیقی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں جس کا اظہار انہوں نے صنفِ افسانہ میں کمال پختگی کے ساتھ کیا ہے۔ ریاض توحیدؔی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کالے پیڑوں کا جنگل'' (۲۰۱۱ءؔ) میں شائع ہوا جس کی پذیرائی اُردو حلقے میں بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اب ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''کالے دیووں کا سایہ'' شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعے کا پیش لفظ کشمیر کے مشہور نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری نے لکھا ہے، حامدی کاشمیری کے مطابق:

''گردوپیش کے ماحول میں لوگوں کو جس ظلم وتشدد سے گذرنا پڑا ہے اس کی تصویریں ریاض توحیدی اپنے افسانوں میں

پورے خلوص دردمندی اور دُکھ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔''
خود ریاض توحیدی نے افسانہ میں حق گوئی پر مبنی سماجی وابستگی کو لازمی قرار دیا ہے۔اپنے مجموعے ''کالے دیوؤں کا سایہ'' میں 'چند باتیں' کے عنوان سے صنف افسانہ اور اپنی افسانہ نگاری کے فکری اور تخلیقی رویوں کی وضاحت کرتے ہوئے خود لکھا ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ جب ظالم کا تیشہ مظلوم کے ننگے بدن پر وار کرتا ہے تو وار سہتے سہتے مظلوم کے دل سے جو پرشور آواز نکلتی ہے وہ آواز ہمارے افسانوں میں بھی سنائی دینی چاہیئے۔ افسانے میں اشاروں، کنایوں میں بات کرنا تو ٹھیک ہے لیکن سچائی کو بیان کرتے ہوئے مصلحت پسندی سے کام لینا میری فطرت کے خلاف ہے کیونکہ میں لنگور کو انگور بنا کر پیش نہیں کر سکتا۔''

''کالے دیوؤں کا سایہ'' میں اٹھارہ افسانے ہیں۔ان افسانوں کے موضوعات، کشمیر کی خوں آشام صورتحال سے لیکر عالمی سطح کے خونچکاں واقعات پر مشتمل ہیں اور سبھی افسانوں کا مرکز توجہ ظالم وجابر ہاتھوں کے کالے کارنامے ہیں.کسی بھی تخلیق میں تخلیق کار کے مقامی ماحول کی عکاسی ضرور نظر آتی ہے.توحیدیؔ کے افسانوں میں بھی وادی کے مختلف علاقوں میں رونما ہونے والے خونچکاں واقعات اور عبرتناک مظالم ومسائل کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ یہ افسانے ،گذشتہ دوڈھائی دہائیوں

میں کشمیر اور کشمیریوں پر گزرنے والے عذاب کے زندہ اور متحرک مرقعے ثابت ہورہے ہیں۔ اس مجموعے کے پہلے افسانے ''چھوڑ دو'' میں کشمیر کے ان ہزاروں معصوم لوگوں کی بدنصیبی کی کہانی ستر سالہ ضعیف جبار چاچا کے حوالے سے بیان کی گئی ہے جس کا اکلوتا نوجوان بیٹا نذیر خان اور اور اکلوتی نوجوان بیٹی شریفہ دونوں اپنے اپنے خوابوں کے ساتھ ظلم کا شکار ہو کر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبار چاچا ان ہزاروں لوگوں کی طرح تنہائی کی زندگی جینے پر مجبور ہیں، جن سے حالات نے ان کی اولاد کو چھین لیا ہے۔

اسی طرح ''گلہ قصائی'' میں افسانہ نگار نے بدی اور خودغرضی اور انسان دوستی کے غلبہ کو ایک ان پڑھ قصائی گلہ کے حوالے سے کہانی بنی ہے اور افسانہ کے بین السطور سے یہ حقیقت جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے کہ وادی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے ذمہ دار افراد خصوصاً ڈاکٹر وغیرہ اب اپنے فرائض منصبی کے تئیں نہ تو مخلص رہے نہ ذمہ دار، جو کشمیر کی روایتی اخلاقی اور انسانی روایات کے یکسر خلاف ہے۔ لیکن کشمیر کا وہ طبقہ جنہیں ان پڑھ اور پست ذہن مانا جاتا ہے ان کے دلوں میں کشمیر کی قابلِ فخر انسان دوستی کے چراغ ابھی بھی روشن ہیں۔ اسی لئے گلہ قصائی ڈاکٹر کی خودغرضی کے سبب اپنی بیٹی کی موت کا انتقام ڈاکٹر کی بیٹی کو گوشت میں زہر ملا کر ہلاک کر لینا چاہتا ہے، لیکن پھر اس پر اس کی نفسیات میں موجود انسانیت، اس کے انتقام کے وقتی جذبے پر حاوی ہو جاتی ہے اور وہ زہر ملا گوشت واپس لے کر ضائع کر دیتا ہے۔

دراصل کشمیر سے باہر کی دنیا کو آج بھی پوری طرح معلوم نہیں کہ

اس چمن میں صیادوں نے گل وبلبل کے شکار کے لئے ایسے ایسے ہتھکنڈھے استعمال کئے اور ایسی ایسی سازشیں رچی ہیں کہ کشمیر کے ایک طبقے کی سوچ اور فکر کی قوت جیسے سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ اس اندوہناک صورت حال کی منظر کشی ''گمشدہ قبرستان'' اور ''خوف'' وغیرہ افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

ریاض توحیدی کے کلیدی افسانے ''کالے دیووں کا سایہ'' میں امن وشانتی قائم کرنے کے ذمہ دار افراد اور اداروں کی جانب سے عام لوگو ں کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک کو بڑی سچائی سے استعاراتی انداز میں پیش کیا گیا ہے اس افسانہ کے درج ذیل اقتباس پر غور کریں:

> ''پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیو تنگ آ گئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اُٹھائے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں مردہ کتوں کے ڈھیر میں ایک خوبصورت نوجوان کی لاش پر نظر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہو کر ڈھیر سے پیچھے ہٹنے لگے۔ انہیں پیچھے ہٹتے ہی کالے دیو آگ بگولہ ہو کر چلانے لگے:

''سالے...... ! پیچھے کیوں ہٹے......؟ ان کتوں کو جلدی جلدی یہاں سے ہٹاؤ، ہوا میں بدبو پھیل رہی ہے۔''

''ان......ان میں ایک انسانی لاش بھی ہے۔'' ایک نوجوان لرزتی آواز میں بول پڑا۔

''اُس کو بھی یہاں سے دفع کرو اور ان کتوں کے ساتھ کسی نالے میں ڈال دو'' کالی غار سے ایک طنز آمیز آواز آئی۔

''لیکن......!''

''سوال مت کرو، نہیں تو تو بھی کُتے کی موت مرے گا، سالا'' ایک اور خوفناک آواز نوجوان کے کانوں سے ٹکرائی۔''

ریاض توحیدی کے افسانے میں عالمی مسائل کی حیران کُن منظرکشی جلوہ گر ہے۔ ۹/۱۱ کے بعد عالمی منظرنامے پر رونما ہو رہے واقعات و حادثات کی تصویر کشی کرتے ہوئے موصوف ''سفید تابوت''، ''مشنِ القدس'' اور ''ہائی جیک'' جیسے افسانوں میں گہرے شعور اور وسیع مشاہدے کے بل پر تہذیبی تصادم کے سازشی محرکات کو علامتی اسلوب کے توسط سے ایکسپوز کرتے نظر آرہے ہیں. افسانہ ''ہائی جیک'' میں ایک عام انسان کے نفسیاتی تناؤ کو سوچ کی ہائی جیک قرار دیتے ہوئے افسانہ نگار جمہوریت کی آڑ میں حیوانیت برپا کرنے والے چہروں کے پردے چاک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دن بھر کی مصروفیات سے تھک ہار کر وہ رات کی تنہائی میں سچ اور جھوٹ کی جنگ کا نظارہ کرنا چاہتا ہے. نیوز چینل کا نمبر ریموٹ پر دباتے ہی اسکرین پر فلیش نیوز آتی ہے:

''ڈرون کے حملے میں اسکول تباہ، درجنوں معصوم بچے موت کی آغوش

میں۔''

''یہ دشت گردی ہے' حیوانیت کے شکار معصوم بچوں کے والدین کا احتجاج۔''

''نہیں...یہ اقدام دنیا میں امن بحال کرنے کے لئے ضروری ہے۔'' سفیر امن کا بیان۔

''ایک خوفناک دھماکے میں نیٹو کے درجن بھر فوجی ہلاک۔''

''یہ دہشت گردی ہے۔''سفیر امن کا بیان''جمہوریت کے دشمنوں سے ضرور بدلہ لیا جائیگا۔''

ریاض توحیدی کو اُردو افسانہ کی روایت، شعریات اور موضوعاتی اور اسلوبیاتی رویوں کی آگہی ہے، انہیں نور شاہ جیسے منجھے ہوئے فکشن نگار کی سر پرستی بھی حاصل ہے لیکن شاعری کی طرح افسانہ بھی مستقل مشق اور ریاضت چاہتا ہے لہذا ریاض توحیدی کو بھی اپنی سوچ اور فکر اور تخلیقیت کے سرمایہ کو نہ صرف محفوظ رکھنا ہے بلکہ اسے اور زیادہ مضبوط و مستحکم بھی کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو صرف کشمیر ہی نہیں اُردو کی عام بستیوں میں بھی بحیثیت افسانہ نگار ریاض توحیدی اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

چند باتیں

مجھے پریوں کی یہ جھوٹی کہانی مت سناؤ تم
میں اپنی آنکھ کے اندر کئی کوہ قاف رکھتا ہوں
(سہیل احمد)

اُردو افسانے کا تاریخی سفر ایک صدی سے زائد عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔اس سفر کی کامیابی کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ عصر حاضر تک اُردو کے کئی ایسے افسانے بھی ادبی منظر نامے پر آتے رہے جنہیں عالمی سطح کے شاہکار افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔افسانے کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔اصل بات تو یہ ہے کہ افسانہ نگار زندگی کے کسی بھی پہلو سے متاثر ہوکر افسانہ لکھنے کی تحریک پاتا ہے۔چند ناقدین کی رائے میں افسانہ زندگی اور زمانہ سے کشید کیا ہوا ایک تخلیقی سچ ہوتا ہے تو اس توضیح کا خیال رکھتے ہوئے ایک افسانہ نگار زندگی کی حقیقت کو تخلیقی سچائی کے ساتھ پیش کرنے سے کیوں کترائے۔اردو کے بیشتر افسانوں میں سچائی کو خاموشی کے غلاف میں چھپایا جا رہا ہے اور ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومیت دونوں سچائیوں کو خاموشی کے قالب میں بند کیا گیا ہے۔جس تحریر سے قاری کی سوچ میں بدلاؤ نہیں آئیگا، انقلاب نہیں آئیگا وہ تحریر اثر پذیر قوت سے محروم رہ جاتی ہے۔اردو میں آج بھی ایسے افسانوں کی ضرورت ہے جنہیں پڑھ کر قاری انقلابی فکر سے آشنا ہو جائے۔بقول شاعر

ہمیں تو اپنے دور میں اک انقلاب چاہیے
جو حوصلوں کا درس دے وہی کتاب چاہیے

میں سمجھتا ہوں کہ جب ظالم کا تیشہ مظلوم کے ننگے بدن پر وار کرتا ہے تو وار سہتے سہتے مظلوم کے دل سے جو پرشور آواز نکلتی ہے وہ آواز ہمارے افسانوں میں بھی سنائی دینی چاہیے۔ افسانے میں اشاروں کنایوں میں بات کرنا تو ٹھیک ہے لیکن سچائی کو بیان کرتے کرتے مصلحت پسندی سے کام لینا میری فطرت کے خلاف ہے کیونکہ میں لنگور کو انگور بنا کر پیش نہیں کر سکتا۔

عصرِ حاضر کے انسان کی سوچ وقت کی مٹھی میں قید ہو چکی ہے۔ وقت کی تیز رفتاری نے اس کے ذہن میں مرضی کے تصور کو غائب کر ڈالا ہے۔ زندگی مصروفیات کی یلغار میں اس طرح پھنس چکی ہے کہ انسان فرصت کے لمحات کو بھی ترجیحات میں تقسیم کرنے پر مجبور نظر آرہا ہے۔ زندگی کی بدلتی ہوئی صورت حال سے قاری کے مزاج میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور وہ بھی اب اپنے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کاری کیلئے وہی تحریر پسند کرتا ہے جو اُسے کم وقت بھی زیادہ تسکین بہم پہنچائے۔ اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب میں کوئی افسانہ لکھنے بیٹھتا ہوں تو لکھنے کے دوران میں افسانے کو غیر ضروری خیالات کی بھرمار سے بچانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ افسانے لکھتے وقت میری سوچ کو قاری کی سوچ کا بھی خیال رہتا ہے تاکہ میرا افسانہ صرف افسانہ ہی نہ رہے بلکہ قاری کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا کماحقہ حق بھی ادا کر سکے۔ ''کالے دیوؤں کا سایہ'' کے نام سے میں اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ قارئین کرام کی خدمت

میں پیش کرنے کی جسارت کرر ہا ہوں۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''کالے پیڑوں کا جنگل'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا ہے۔ مذکورہ مجموعے کے تعلق سے بہت سے قارئین نے راقم کو اپنے اپنے تاثرات سے نوازا اور چند اہل علم کے تبصرے بھی مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہے، جن میں جناب نور شاہ، جناب پروفیسر محمد اسلم، جناب زاہد مختار، جناب منظور احمد خان اور جناب شفیع احمد ڈار وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ راقم الحروف ان تمام اہل علم و دانش کے خلوص بھرے جذبات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، میں پروفیسر قدوس جاوید صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کے دانشورانہ خیالات سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔

پروفیسر حامدی کاشمیری صاحب کا میں خاص طور سے مشکور ہوں کہ موصوف نے علیل ہونے کے باوجود میرے اس مجموعے کو اپنے زریں خیالات سے نوازا۔

''کالے دیوؤں کا سایہ'' قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔ امید کرتا ہوں کہ معزز قارئین مطالعہ کرنے کے بعد راقم کو اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے۔

شکریہ

طالب راہ

ریاض توحیدی

۱/ دسمبر ۲۰۱۳ء

چھوڑ دو

کالے ناگ نے پھن مارتے مارتے اُس کی یاداشت کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ ماضی کی دردناک یادوں کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے وہ جب اپنے اپاہج وجود کو بستر پر ڈال دیتا ہے تو رات کے سیاہ سایوں کے درمیان دیواروں پر اُبھرتی ڈوبتی پُر ملال صورتوں کی نمناک آنکھوں کے ٹپکتے شبنمی قطروں سے وہ لرز اُٹھتا ہے۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی جب اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے لرزتے وجود کو سفید لحاف کے اندر چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو دیوار کی اُبھرتی ڈوبتی صورتوں کا خوفناک منظر اُس کے دل و دماغ میں ایسا طوفان برپا کر دیتا ہے کہ اُس کا اپاہج جسم زلزلے کے شدید جھٹکوں سے ہلنا شروع ہو جاتا ہے اور اُس کے کانپتے ہونٹوں اور کڑکڑاتے دانتوں سے ایک ہی آواز اندھیرے میں گرجتی رہتی ہے.....اُسے چھوڑ دو......! چھوڑ دو......!!!

جبار چاچا کا ناتواں جسم ستر کے پڑاؤ پر کھڑا ہے۔ کبھی اُس کا بھی ایک خوشحال خاندان تھا۔ اُس کی زندگی کا اثاثہ اُس کے کھیت کھلیاں تھے جن کی دیکھ ریکھ اُس کا پیشہ تھا۔ نذیر خان اُس کا اکلوتا بیٹا تھا اور شریفہ اُس کی اکلوتی بیٹی۔ جبار چاچا کی تمنا تھی کہ اُس کے بچے پڑھ لکھ کر باعزت زندگی گزار سکیں۔ اُس نے دونوں کی اچھی پرورش کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

نذیر خان گریجویشن کے آخری سال میں تھا اور شریفہ گریجویشن کے پہلے سال میں تھی۔ گاؤں کے لوگ جبار چاچا کے نام اور کام پر یہ سوچ کر رشک کرتے رہتے کہ اَن پڑھ ہونے کے باوجود اس نے اپنے بچوں کو تعلیم کے نور سے منور کرنے میں بڑے پاپڑ بیلے ہے۔ اُس کے دونوں بچے بھی باپ کی محنت ومشقت کا خیال رکھتے ہوئے پڑھائی کی طرف بڑا دھیان دیتے رہتے، نہیں تو گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح ان کی تان بھی میٹرک تک ہی ٹوٹ جاتی۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ جبار چاچا جب گھر میں آجاتا تو دونوں بچے اُس کے سامنے بیٹھ جاتے اور کالج کے دن بھر کے پروگراموں کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔ جبار چاچا ان کی باتیں سُن کر خوش ہو جاتا اور کہتا رہتا کہ میرا خواب ہے کہ جب تم دونوں پڑھ لکھ کر ماسٹر بن جاؤ گے تو میرا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا۔ نذیر خان باپ کی باتیں سن کر مذاقاً کہتا کہ بابا اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے تمہاری سوچ بھی چھوٹی ہے۔ مجھے سول سروسز کا امتحان پاس کر کے بڑا افسر بننا ہے اور مُنی کو لیکچرار بننا ہے۔ جبار چاچا بیٹے کی باتیں سُن کر زبان سے کہتا کہ مجھے افسری اور لیکچرری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن دل ہی دل میں خدا تعالیٰ سے دُعا کرتا رہتا کہ اُس کے بچوں کی مراد پوری ہو جائے۔

گاؤں کے اوپر ظالموں کا خوف طاری تھا۔ ظالموں کی وحشت ناک حرکتوں سے بستی کے لوگ تنگ آچکے تھے۔ روز روز کے دل دوز واقعات و سانحات سے لوگوں کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔ خوف کا سائرن فضا میں

لگا تار بجتا رہتا۔ اس پُر گھٹن ماحول میں جبار چاچا کے بچوں کا تعلیم جاری رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ایک دن شریفہ کالج سے گھر لوٹ رہی تھی کہ اچانک ظالموں کی ایک تیز رفتار گاڑی نے بستی کے ایک پھول جیسے بچے کو سڑک کنارے کچل ڈالا۔ بستی کے لوگوں نے احتجاج کرتے ہوئے نزدیکی پولیس اسٹیشن میں کیس دائر کر دیا۔ پولیس نے مشتعل لوگوں کے دباؤ میں آ کر کیس عدالت میں پیش کیا اور شریفہ بحیثیت عینی گواہ عدالت میں حاضر ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب قاتلوں کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم ملا تو وہ کیس کو دبانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔ وہ شریفہ کو اپنے راستے کا سب سے بڑا کانٹا سمجھ کر دھمکانے لگے کہ وہ عدالت میں اُن کے خلاف گواہی دینے سے باز رہے۔ شریفہ کے انکار نے ظالموں کے غرور کو للکارا اور وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی سبیل سوچنے لگے۔

نذیر خان گریجویشن کے آخری ایام میں ہی سِول سروسز کے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ اسی دوران گھر والوں نے اُس کا رشتہ ایک نزدیکی رشتہ دار کے ہاں طے کیا۔ شادی کی تیاری بڑے زور شور سے ہونے لگی۔ شادی کے دن سارے گاؤں میں جشن کا ماحول تھا۔ دلہن کو پُر مسرت ماحول میں گھر لایا گیا۔ تمام مہمان رخصت ہوئے۔ نذیر خان کی ماں بار بار دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی اور جبار چاچا بڑے سکون سے حُقے کے کش لیتے لیتے سوچ رہا تھا کہ اُس کی زندگی کا پہلا خواب پورا ہو گیا۔ آدھی رات تک جب تمام لوگ اُدھر اِدھر کی باتیں کرتے کرتے تھک گئے تو جبار چاچا نے شریفہ کو بستر

بچھانے کے لئے کہا۔ شریفہ ابھی بستر بچھانے کی تیاری ہی کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ گھر والے ابھی دروازہ کھلونے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ آٹھ دس ہتھیار بند نقاب پوش بدمست ہاتھیوں کی طرح، شریفہ کہاں ہے؟ شریفہ کہاں ہے؟ چلاتے ہوئے کمرے میں گھس گئے۔ چند ہی منٹوں کے اندر ایک دیوقد ظالم شریفہ کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر گھر سے باہر لے گیا۔ شریفہ دردناک آواز میں بھیا مجھے بچاؤ...... بابا مجھے بچاؤ چلاتی رہی۔ جبار چاچا اپنی معصوم بیٹی کو بچانے کے لئے ظالموں کے پیر پکڑ کر گڑگڑاتے ہوئے اُن سے اپنی بیٹی کی زندگی کی بھیک مانگنے لگا لیکن ان سنگ دلوں نے بندوق کے ایک ہی وار سے اُس کا سر پھوڑ ڈالا۔ وہ زخمی کبوتر کی طرح پھڑ پھڑاتے ہوئے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ظالموں کی یہ درندگی دیکھ کر نذیر خان کا خون کھول اُٹھا اور وہ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر ظالموں کے پیچھے دوڑ پڑا۔ اُس کی نئی نویلی دلہن بھی عروسی لباس میں ہی اس کے پیچھے پیچھے روتی بلکتی دوڑ پڑی۔ ظلم کی اندھی تلوار اندھیرے میں چمک اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے عدم تشدد کے بوسیدہ کھنڈ رسے جمہوریت کے کھوکھلے ایوان بھڑک اُٹھے۔ جلتے ایوانوں کے بھڑکتے شعلوں نے مظلوموں کو جلا کر راکھ بنا ڈالا۔ کالے بادلوں کی کڑکتی بجلی نے روشن ستاروں کو بھسم کر ڈالا۔

برسوں سے وہ ایک زندہ لاش بن کر بے بسی کے عالم میں زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اُس کے کان بچوں کی میٹھی میٹھی باتیں سننے کے لئے ترس

رہے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جب وہ اپنے اپاہج جسم کو بستر کے اوپر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو کمرے کی دیواروں سے نذیر اور شریفہ کی اُبھرتی ڈوبتی صورتیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے اپنے منہ کو سفید لحاف میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اُس کے کانوں سے بیٹی کی دردناک آواز ٹکراتی ہے...... بابا...... مجھے بچاؤ...... بابا...... مجھے بچاؤ۔ وہ لحاف کے اندر منہ چھپائے بے خودی کے عالم میں بڑبڑاتا رہتا ہے۔ اُسے چھوڑ دو...... چھوڑ دو......!!!

روز تصویریں اُبھر آتی ہیں دیواروں پر
جانے والوں کو مکاں یاد کیا کرتے ہیں

(عالم خورشید)

ہائی جیک

سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلیوں نے پُرسکون سمندر کی خاموش لہروں کو سونامی کا روپ دھارنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس کا جزیرہ نما دل بھڑکتے شعلوں کا خندق بن چکا ہے اور برستی آگ کی سلسلہ وار پھٹوں نے اس کے دماغ میں غم اور خوشی کے تصور کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ اس کی نمناک آنکھیں، سنہرے اُجالے کی تلاش میں، کالے رات کے قیامت خیز اندھیرے کو کاٹتے کاٹتے تھک چکی ہیں۔ خوف زدہ دماغ کے مایوس خیالات اسے اشارہ کر رہے ہیں کہ شاید سنہرے اُجالے کے چمکتے آفتاب کی روشن کرنوں کو کالے بادلوں نے قید کر رکھا ہے۔ اس کا ارتعاش شدہ جزیرہ غم ناک سونامی کی خون آشام لہروں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ یہ خون آشام لہریں شاہینی سوچ رکھنے والے انسانوں کو ہی اپنا شکار بنا رہی ہیں۔ ان کی اندھی یلغار کا ایک ہی مقصد ہے کہ ہر شاہین کی پرواز آمنا وصدقنا کے حدود تک محدود رہے۔ پرواز کی ہر آزادی پر قدغن لگائی جائے اور ان کی پسند سب کی پسند......!!

اُس کا پریشان دماغ سوچنے کی صلاحیت کے باوجود بھی صحیح سوچ نہیں سکتا کیونکہ اندھیرے نے اس کی سوچ کو ہائی جیک کر رکھا ہے۔ مذہب کا پرستار ہونے کے باوجود بھی وہ مذہب کو اپنا نہیں سکتا۔ مذہب کو اب صرف

سیاست کے قالب میں بند کیا گیا ہے۔ مذہب کی تعلیم اُسے بتا رہی ہے کہ ہر انسان کو پہلے انسان کی طرح سمجھو اور انسانیت کو ترجیح دو، لیکن وہ مذہبی تعلیم پر کیسے عمل کر سکتا ہے کیونکہ اس کی سوچ تو ''ہائی جیک'' ہو چکی ہے جو اُسے بتا رہی ہے کہ یہاں تو انسان نے اپنی سوچ کا مذہب بنا رکھا ہے۔ یہاں تو ہر قوم اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے مذہب کا استحصال کر رہی ہے۔ مذہب، انسان کو اپنی فکر بخشتا ہے لیکن یہاں تو انسان اپنی سوچ کو مذہبی فکر کا لبادہ پہنا رہا ہے اور مذہبی فکر کو اپنی سوچ کی زمین میں ڈال کر نئے نئے نظریات کے پودے اُگا رہا ہے۔ کوئی قدامت پرستی کا اسیر اور کوئی جدیدیت کا یرغمال......انتہا پسندی صرف انتہا پسندی......!!

دن بھر کی مصروفیات سے تھک ہار کر وہ رات کی تنہائی میں سچ اور جھوٹ کی جنگ کا نظارہ کرنا چاہتا ہے۔ نیوز چینل کا نمبر ریموٹ پر دباتے ہی اسکرین پر فلیش نیوز آتی ہے:

''ڈرون کے حملے میں اسکول تباہ، درجنوں معصوم بچے موت کی آغوش میں۔''

''یہ دہشت گردی ہے، حیوانیت کے شکار معصوم بچوں کے والدین کا احتجاج۔''

''نہیں ایسے اقدام دنیا میں امن بحال کرنے کے لئے ضروری ہیں۔'' سفیر امن کا بیان۔

''ایک خوفناک دھماکے میں نیٹو کے درجن بھر فوجی ہلاک۔''

یہ دہشت گردی ہے'' سفیر امن کا بیان ''جمہوریت کے دشمنوں سے ضرور بدلہ لیا جائے گا۔''

اس کی سوچ ان خون آشام مناظر کو دیکھتے دیکھتے یہ سمجھنے سے قاصر نظر آرہی ہے کہ اصلی دہشت گرد کون ہے......؟''

وہ ہسٹری چینل کا بٹن دباتا ہے۔ وہاں پر بھی اسے صرف آگ کے گولے ہی نظر آرہے ہیں۔ وہ سوچتا ہے:

''انسان نے لالچ کو اپنا دیوتا بنالیا ہے اور اس کی حیوانیت کے سیاہ کارنامے لکھتے لکھتے انسانیت کی تاریخ اب بوڑھی ہو چکی ہے وہ اب صحیح اور غلط کو پہچاننے سے بے زار نظر آرہی ہے۔''

مرنے اور مارنے والوں کے فلسفۂ امن کے پروپگنڈہ نے اُس کے ذہن میں انتشار کا طوفان برپا کر رکھا ہے۔ وہ انسان کی چینل سے مایوس ہو کر اب حیوانوں کی چینل کا بٹن دباتا ہے۔ اینمل چینل پر افریقہ کے وہ گھنے جنگل دکھائے جارہے ہیں جن میں غیر مہذب جنگلی جانور کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک خوبصورت جھیل کے کنارے سینکڑوں ہرن پُر امن ماحول میں پانی پی رہے ہیں۔ جھاڑیوں کے پیچھے خون خوار شیر حملے کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ طاقت کے نشے میں مست یہ خونخوار درندے اچانک ہرنوں پر جھپٹ پڑتے ہیں، ہرنوں کے جھنڈ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ بہت سارے ہرن درندوں کے شکار بن گئے۔ زخمی ہرن خوف کے مارے جھیل میں کودتے چلے گئے۔ جھیل کے پُرسکون پانی میں ارتعاش کی لہریں اُٹھنے

لگیں اور نیلا پانی سرخ مائل ہوتا گیا۔

معصوم ہرنوں کے خون سے درندوں کا پیٹ بھر گیا تھا اور اُن کے خون آلودہ منہ فتح کی دھاڑ سے گرج رہے تھے۔ ان درندوں کی گرجدار آواز سارے جنگل میں گونج رہی تھی کہ یہاں ہمیشہ طاقت کی بادشاہت رہے گی۔ یہ خوفناک نظارہ دیکھتے دیکھتے اُس کی سوچ میں اُبال آیا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی سوچ ہائی جیکر کے شکنجے سے آزاد ہورہی ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا...... حیوان کون......؟

ہارٹ اٹیک

سرما کا موسم تھا۔ زبردست برفباری ہورہی تھی۔ شام کے پانچ بج چکے تھے اور شہر سے دیہات کی طرف جانے والی یہ آخری ٹیکسی تھی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اُسے وہاں پچاس برس کا ایک موٹا تازہ شخص کالے رنگ کا ایمپورٹڈ اُورکوٹ پہنے نظر آیا۔ اُس نے اپنے دستانے نکال کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ دے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹاٹ کی اور وہ فوجی بنکروں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اُورکوٹ والا شخص اُسے دیکھ کر کچھ گھبراسا رہا ہے اور وہ کن آنکھیوں سے اُس کی طرف بار بار دیکھ رہا ہے۔ اُس کے لمبے لمبے بال اور گھنی داڑھی کا حُلیہ اُورکوٹ والے شخص کے خوف کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ اجنبی سواری کی بے قراری کو بھانپنے کے باوجود بھی وہ خاموش رہا لیکن جب ڈرائیور نے اُورکوٹ والے شخص سے خیر وعافیت پوچھی تو وہ اُس کا نام سُن کر چونک گیا اور اُس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ اُورکوٹ والا ڈرائیور سے سہمی سہمی آواز میں بات کررہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اُس کا ذہن کسی بڑی نفسیاتی الجھن میں پھنسا ہوا ہے اور اُس کے الفاظ ٹوٹ رہے ہیں۔ بات کرتے کرتے اُس کے چہرے سے سخت سردی کے باوجود پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ گاڑی منزل کی جانب دوڑ

رہی تھی اور اندھیرا بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ سکوت کا عالم توڑتے ہوئے اُسے پوچھنے لگا کہ ''آپ شاید وہی سیف الوقت تو نہیں ہیں جسے امن بحال کرنے کے عوض ''سرکار کی طرف سے 'ایوارڈ'' ملنے والا ہے۔ ''ہاں...... ہاں'' وہ جلدی میں بول پڑا۔ ''لیکن میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔''

''میرا نام محتسب ہے'' وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بول پڑا۔ ''ہم دونوں ایک ہی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کے نام اور کام کے بارے میں، میں سب کچھ جانتا ہوں۔''

''سب کچھ جانتے ہو'' وہ گھبراہٹ سے پوچھنے لگا۔ ''لیکن...... کیوں ...... کیسے......؟''

وہ اُس کی بدلتی ہوئی حالت کا حیرانی سے جائزہ لینے لگا۔ ''آپ کیوں پریشان سے نظر آرہے ہیں؟'' محتسب نے سوال کیا۔

''نہیں...... نہیں'' یہ کہتے ہوئے وہ رومال سے چہرے کو صاف کرنے لگا ''کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''جی ...... میں ایک اسکالر ہوں'' محتسب نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''میرے مقالے کا عنوان ہے ''گمشدہ نسل''

''گمشدہ نسل'' وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا ''بڑا عجیب سا موضوع ہے۔''

''عجیب سا موضوع''، محتسب تشویش آمیز لہجے میں پوچھ بیٹھا ''آپ کو یہ عجیب موضوع لگ رہا ہے۔''

''نو، سوری'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولا ''بس یونہی منہ سے نکل گیا۔''

محتسب اُس کی اندرونی حالت کو بھانپ گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس شخص کے ذہن پر انجانہ سا خوف طاری ہے اور وہ اس کی ہر بات کو شک کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اُسے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ وہ واقعی ریسرچ اسکالر ہے یا کوئی......!

محتسب نے اُس کو اپنی حالت پر چھوڑا اور آنکھیں بند کر کے اُس کے شب و روز پر غور کرنے لگا۔

محتسب یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہا تھا۔ وہ وادی کی اُس گمشدہ نسل پر تحقیق کر رہا تھا جو پچھلی دو دہائیوں سے لاپتہ ہو چکی تھی۔ وادی کے قبرستانوں میں سینکڑوں بے نام لاشیں دفن تھیں اور ان لاشوں کے سوداگر مختلف ایجنسیوں سے اپنا اپنا خراج وصول کرتے آئے تھے۔ گمشدہ نسل کے وارثوں نے حقوق انسانی کے عالمی ایوانوں تک اپنی بات پہنچائی تھی اور اپنے غائب شدہ بچوں کی واپسی کے لئے احتجاجی راستہ اپنایا تھا لیکن جہاں عقابوں کے نشیمن پر زاغوں کا قبضہ ہو وہاں انصاف کی توقع رکھنا پتھر سے پھول نکالنے جیسا عمل ہوتا ہے۔ سیاست کے سوداگر اپنی اپنی سیاسی دکان چمکانے کے لئے انصاف کے متلاشی احتجاجیوں کا من پسند استحصال کرتے آئے تھے۔ سیف الوقت بھی ان ہی سوداگروں میں سے ایک تھا جنہوں نے دولت اور شہرت کمانے کے لئے سینکڑوں انسانوں کی زندگیوں کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔ سیف الوقت یعنی وقت کی تلوار، اس کا اصلی نام نہیں تھا بلکہ یہ نام

اس نے ان دنوں اپنایا تھا جب وہ ایک تحریک کا حصہ بن گیا تھا۔ دوسرے کئی لوگوں کے ساتھ وہ اس تحریک کو چلانے کے لیئے رات دن کام کرتا رہتا۔ علاقے کے لوگ اُس کی ہر بات پر یقین کی مہر ثبت کرتے تھے۔ وہ دس سالوں کے بعد شہر سے گاؤں کی طرف آرہا تھا۔ ان دس برسوں میں بستی کو کن کن آفتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ اس سے لاتعلق رہا۔ وہ بستی جو کبھی خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتی تھی اب گورستان کی کہانی بن گئی تھی اور ہر گھر میں ماتم کی شمعیں جلتی تھیں ۔اس گلستان جیسی بستی کو گورستان بنانے کا ذمہ دار یہی سیف الوقت تھا۔ برسوں پہلے اس شخص نے ایک آواز بلند کی تھی جو بستی کے لوگوں کے لئے ایک نئ آواز تھی ۔بستی کا ہر فرد اُس کی آواز پر لبیک کہتا گیا۔ وہ ہر گلی، ہر کوچے میں اسٹیج سجاتا گیا اور بستی کے نوجوانوں کو اپنے مشن میں شامل کرتا رہا۔ وہ انہیں آزادی کے سنہرے خواب دکھاتا رہا اور نوجوان اس خواب کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان خطروں میں ڈالتے گئے ۔کئی برسوں تک بستی نوجوانوں سے خالی ہوتی چلی گئی۔ ہر انسان بندوق کی بولی بولنے لگا اور ہر کان گولیوں کی آواز پسند کرنے لگا۔ انسانی لاشوں سے نئے نئے قبرستان آباد ہوتے گئے ۔اس شخص کا حکم کسی بھی انسان کے لئے موت اور زندگی کا حکم ہوتا تھا۔ برسوں تک یہ خون آشام سلسلہ چلتا رہا اور نوجوان مشنِ آزادی کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ بستیاں کھنڈرات بنتی گئی اور چمنستان ویران ہوتے گئے۔

ایک دن سیف الوقت اچانک غائب ہوگیا۔ اس کی جگہ دوسرے

لوگوں نے سنبھالی۔ مشن چلتا رہا۔ بستی سے جوانوں کا صفایا ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ بندوق کا خوف دم توڑنے لگا لیکن رات کے اندھیرے میں گھروں سے نوجوان غائب ہونے شروع ہو گئے۔ ہر انسان خوف زدہ تھا، ہر زبان گنگ تھی۔ کسی کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ رات کے سیاہ سائے میں ان نوجوانوں کو کون سے ہاتھ اُٹھا کر غائب کر رہے ہیں۔ کئی برسوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مشن آزادی کے میر کارواں نے مشن امن کی علم بلند کی تھی۔ وہ مشن آزادی کی ایجنسی سے ناطہ توڑ کر مشنِ امن کی ایجنسی کا حامی بن گیا تھا۔ وہ شہر میں مشنِ امن کا دفتر چلا رہا تھا اور کئی بڑے بڑے محلوں کا مالک بن گیا تھا۔

ٹیکسی دو گھنٹے سے لگاتار چل رہی تھی۔ گاؤں پہنچنے تک ابھی گھنٹہ بھر فاصلہ تھا۔ محتسب نے آنکھیں کھولیں اور سیف الوقت کی طرف دیکھنے لگا۔ سیف الوقت کے چہرے پر ابھی بھی خوف چھایا ہوا تھا۔ محتسب نے سوچا کہ اُس کی تحقیق کے حوالے سے سیف الوقت سے کافی مواد مل سکتا ہے۔

''آپ پہلے مشنِ آزادی کے علمبردار تھے'' محتسب نے پہلا سوال کیا ''اور اب مشنِ امن کا دفتر چلا رہے ہیں۔''

''جی ہاں'' سیف الوقت نے اثبات میں جواب دیا ''میں وادی میں پھر سے امن بحال کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن جن لوگوں نے آپ کی آواز پر اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دی'' محتسب نے ایک اور سوال پوچھ ڈالا ''ان کی قربانیاں آپ کس مشن میں ڈالتے ہیں، مشنِ آزادی یا مشنِ امن......؟''

''دیکھئے جناب'' سیف الوقت نے تھرتھراتی آواز میں کہا'' میرا مشن اب نوجوانوں کو واپس قومی دائرے میں لانا ہے۔''

''اچھا...... یہ جو سرکار کی طرف سے آپ کو ایوارڈ ملنے والا ہے'' محتسب نے ایک دردانگیز سوال پوچھا'' ضمیر کی آواز پر مجھے بتائے کہ آپ اس کے حق دار ہیں کہ نہیں؟''

یہ سوال سنتے ہی سیف الوقت کے ذہن پر کوڑے برسنے لگے۔ بلڈ پریشر بڑھنے کی وجہ سے اُس کے چہرے پر سُرخی پھیلنے لگی اور دانت زور زور سے بجنے لگے۔ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اُس کا سارا وجود لرزنے لگا۔ اُس نے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھا اور آخری ہچکی لیتے ہوئے اُس کے منہ سے نکل پڑا۔'' ہارٹ اٹیک''۔

زندگی کا بازار

وہ صبح سویرے کسی دانا شاعر کا یہ دردناک مصرعہ ''زندگی کی سب دکانیں بند ہے اس شہر میں'' بلند آواز سے گاتا ہوا پاس والی گلی سے گزرتا رہتا۔ اس کا درد بھرا آہنگ اس قصبہ نما کالونی کے ہر گمشدہ دل کے ساتھ ساتھ میرے منتشر ذہن پر بھی درد بھرا تیشہ چلا کر جاتا۔ کچی عمر میں جب بھی اس کی دردناک آواز میری کچی نیند پر بیداری کا ہتھوڑا اچلاتی تو میری ناگوار طبیعت دل ہی دل میں اس کو کوستی رہتی اور میری زبان سے بے ساختہ نکل پڑتا۔

''یہ کس نے پھونک دیا صور وقت سے پہلے
اُٹھا ہوں آنکھوں میں اِک خوابِ نا تمام لئے''

اُسے وقت کی پابندی کا پورا احساس تھا۔ وہ وقت کی اہمیت سے بے خبر انسانوں کی اس بستی میں جب قدم رکھتا تھا تو گلی گلی کوچہ کوچہ آواز لگاتے لگاتے گزر جاتا۔ گٹھری کے بار سے اُس کی کمر ہمیشہ جُھکی سی رہتی تھی۔ وہ کسی بھی گلی کے نکڑ پر تھوڑی دیر تک منتظر گاہکوں کا انتظار کرتا اور جب گاہک آجاتے تو وہ اپنی گٹھری کا بند منہ کھول دیتا اور بڑی مسرت کے ساتھ ضرورت مند گاہکوں کی حاجت پوری کر دیتا۔ گاہک بھی اپنی من پسند چیزیں خریدنے کے بعد بھی کافی دیر تک اس کے ارد گرد دائرے کی صورت میں کھڑے رہتے

اور اس کی روح افزا اور دانشمندانہ باتیں سنتے سنتے روحانی طور پُرسکون محسوس کرتے تھے۔ لوگوں کی مادی اور روحانی حاجت روائی کے بعد وہ گٹھری کا منہ بند کر کے دوسری گلی کی طرف قدم بڑھاتا اور اس کا یہ سفر طلوع آفتاب سے لیکر غروب آفتاب تک روز جاری رہتا۔

میں اکثر محسوس کرتا تھا کہ لوگ بڑے شوق سے اُس کی باتیں دہراتے رہتے ہیں اور اُس کی دانائی کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے ہیں۔ غم اور خوشی کی محفلوں میں اُس کا ذکر ضرور رہتا۔ بزرگوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی دور دراز دیہات کا رہنے والا ہے اور کئی دہائیوں سے لگاتار پو پھٹتے ہی اس بستی میں قدم رکھتے آیا ہے اور روزی روٹی کمانے کے ساتھ وہ بستی کے سُکھ دُکھ میں بھی بغیر کسی لالچ کے شرکت کرتا رہتا ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی کی زبان سے اُس کے متعلق کوئی ناخوشگوار بات نہیں سنی، ہر ایک کی زبان پر اُس کی تعریف ہی ہوتی تھی۔ حدِ بلوغ تک پہنچتے پہنچتے میرے دل میں اُس کی آواز اُترتی گئی اور جس صبح اُس کی مانوس آواز میرے کانوں سے نہیں ٹکرا جاتی تو میں حسب عادت وقت پر جاگ جاتا اور نیند بھری آنکھوں سے کھڑکی کھول کر پاس والی سنسان سڑک کو دیر تک جھانکتا رہتا۔ اُس کو غیر حاضر پا کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ساری کالونی پر مایوسی کا عالم چھایا ہوا ہے اور چناروں پر بیٹھے پرندے بھی اپنی اپنی چونچ بغل میں چھپائے مایوس نظر آرہے ہیں۔ میں جب اس مایوس زدہ ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا تو میں یہ سمجھنے سے قاصر رہ جاتا کہ یہ بے زبان پرندے کیوں مایوس دکھائی دیتے ہیں شاید وہ

بھی میری طرح مانوس آواز نہ سُن کر مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ انسان سوچ کی بنیاد پر کسی آواز سے خوشی یا غم کا اثر لیتا ہے لیکن یہ پرندے...... خیر میں اپنی منتشر سوچ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑکی بند کر دیتا تھا اور کام پر نکلنے کی تیاری میں لگ جاتا، لیکن بے قراری کا عالم دن بھر میرے وجود پر چھایا رہتا۔

آہستہ آہستہ اُس کی آواز دوسرے لوگوں کی طرح میری سوچ پر بھی اثر انداز ہوتی گئی اور میں اُس کی صدائے جرس سنتے ہی بستر سے اُٹھتا اور صبح سویرے اس کی مجلس میں چلا جاتا۔ وہ نکڑ پر کھڑے پرانے گھنے چنار کے سائے تلے اپنی دکان لگاتا رہتا۔ بچے، جوان، بوڑھے اور مرد و زن اس کے ارد گرد جمع رہتے۔ اس کی گٹھری میں بچوں سے لیکر بڑھوں تک کا چھوٹا موٹا گھریلوں سامان دستیاب ہوتا تھا۔ بچے جب اُس کی چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے رہتے تو ناراض ہونے کے بجائے وہ انہیں ہنستے مسکراتے وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا رہتا اور جب کوئی معصوم بچہ اُسے پوچھے بغیر یا پیسہ دے بغیر کوئی چیز اُٹھا کر کھا جاتا تو وہ اُس کو بھی نہیں ڈانٹتا تھا۔ بچے اکثر اُسے پوچھتے رہتے کہ پھیری والے چچا! ''کیا تمہارے گاؤں میں سیب کے باغ ہوتے ہیں؟'' وہ تھیلے سے سیب نکال کر انہیں بڑے پیار سے دیتے ہوئے کہتا رہتا ''ہاں! ہمارے گاؤں میں بڑے بڑے سیب کے باغ ہیں۔''

اُس کی گٹھری میں جتنی بھی چیزیں ہوتی تھیں وہ سب بیچتا رہتا ایک سفید کپڑے کے، باقی رنگ کے کپڑے تو وہ فروخت کرتا لیکن وہ سفید کپڑا

کسی کو بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک مرتبہ جب کسی نے اُسے وہ سفید کپڑا بیچنے کے بارے میں کہا تو وہ تیز لہجے میں بول پڑا کہ

''زندگی کی مصنوعی چہل پہل نے آپ لوگوں کی سوچ سے موت کا تصور چھین لیا ہے...... یہ میرا کفن ہے نہ جانے کب اور کہاں اس کی ضرورت پڑے گی۔'' میں اس کی حقیقت پسندانہ سوچ پر حیران رہ گیا۔

اتوار کے دن وہ کافی دیر تک چنار کے سائے تلے بیٹھتا رہتا اور لوگ بھی فرصت کے لمحات کا فائدہ اُٹھا کر اُس کے اردگرد جمع رہتے اور ذہنی سکون سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے رہتے۔ ایک دن بھری محفل میں کسی نوجوان نے اُسے پوچھا:

''چچا! آپ کے گاؤں میں جدید سہولیات کی کون کون سی چیزیں دستیاب ہیں۔''

نوجوان کا سوال سُن کر اُس نے ہر طرف نظر گھمائی۔ سامنے عالیشان محل نما مکانات کا ایک گھنا جنگل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اے سی رومز، کمپیوٹرس، کیبل کنکشنز، نئے ماڈلز کی نئی نئی گاڑیاں، اولڈ ایج ہاوس، چائلڈ کیر سنٹرس وغیرہ جیسی جدید سہولیات سے کالونی بھری پڑی تھی۔ ان تمام خارجی سہولیات کے باجوود کالونی کی داخلی زندگی سکون سے خالی نظر آرہی تھی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جب کوئی انسان رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹ جاتا تو وہ صرف اپنی آنکھیں بند کرسکتا تھا۔ دماغ کو راحت دینے کے لئے اُسے نیند کی گولیوں کو سہارا لینا پڑتا۔ ہر شخص کے خیالات کی نازک کشتی

ٹینشن کے گہرے سمندر میں ڈوبتی ہی چلی جارہی تھی۔ مادی چیزوں کو پانے کی دوڑ میں انسان کی فطرت حیوانی خصلت میں بدل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے انسانیت پر حیوانیت کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ کالونی کے قبرستان میں ایک بڑا پولیس اسٹیشن موجود تھا جو زندوں کو مُردوں کی ہڈیاں چبانے سے کبھی کبھی باز رکھتا تھا۔ رات کے گہرے سائے پڑتے ہی زندگی کا بازار بند ہو جاتا۔ اور ہر انسان پریشان حالی کے بھنور میں پھنس جاتا۔ کچھ دیر کالونی کی پراسرار زندگی کے اتار چڑھاؤ پر سوچنے کے بعد وہ بڑی سنجیدگی سے نوجوان کے سوال کا جواب دینے لگا:

''بیٹا! ہمارے گاؤں میں سب کچھ قدیم ہے۔ صاف وشفاف چشمے اُبلتے ہیں، تازہ ہوا چلتی ہے، بغیر ملاوٹ کھانے کی چیزیں ملتی ہیں۔ لوگ اپنے ہاتھوں سے زراعت کماتے ہیں۔ تازہ پھل کھاتے ہیں۔ ہری ہری سبزیاں اُگتی ہیں۔ لوگ محنت کرتے ہیں، صحت مند ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ وہاں انسان...... انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں محبت کے سمندر موجزن ہیں اور ہونٹوں پر فطری مسکراہٹ کے پھول کھلتے ہیں، وہاں کے ماحول میں امن وسکون کی خوشبودار مہک چھائی رہتی ہے۔''

ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نوجوان حیرت انگیز آنکھوں سے پھیری والے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عورتیں آبدیدہ نگاہوں سے مردوں کے چہروں کو پڑھ رہی تھیں اور مرد مایوس بھری نظروں سے بستی نُما جنگل کا

مشاہدہ کررہے تھے۔ میں رات کا کھانا کھانے کے بعد جب بستر پر نیند کی تلاش کے لئے لیٹ گیا تو نیند کے بدلے دانا پھیری والے کے دانشمندانہ خیالات اور خلوص بھرے جذبات میرے ذہن پر چھائے رہے اور میں اپنے گردونواح میں چھائے ہوئے مصنوعی ماحول کی زہرناک فضاؤں سے رہائی پانے کے بارے میں سپیدہ سحری تک سوچتا رہا۔ نیند کا خمار جب میرے دماغ پر چڑھنے لگا تو اونگھتے اونگھتے میری آنکھ لگ گئی۔ اچانک میرے کانوں کے ساتھ پھیری والے کی دردناک آواز ٹکرائی کہ ''زندگی کی سب دکانیں بند ہیں اس شہر میں۔'' میں نیند کے گہرے سمندر سے نکل کر زندگی کی کشتی کا مسافر بن گیا۔ سورج کی چمکتی کرنیں جب میری خواب گاہ میں داخل ہوگئیں تو میں نیند بھری آنکھوں سے کھڑکی کھول کر سنسان گلی میں اُس آواز کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا لیکن گمشدہ آواز کا کہیں بھی پتہ نہ چل سکا۔ تمام کالونی پر تشویشناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کالونی کی کہرزدہ فضاؤں میں چیل کوئے لمبی لمبی اُڑان بھرنے میں مگن تھے۔ گھنے چنار کے ہرے پتوں پر خزاں کا سایہ پڑ چکا تھا اور بستی کا سیاہ دھواں یہ اشارہ کررہا تھا کہ شاید اب بستی کی فضاؤں میں کسی پھیری والے کی دردناک آواز کبھی نہیں گونجے گی......کبھی نہیں......کبھی نہیں......!!!

کالے دیوؤں کا سایہ

غروب آفتاب کے ساتھ ہی کالے دیوؤں کا خوفناک سایہ بستی کی خاموش فضا پر آندھی بن کر چھا جاتا اور شل زدہ ذہنوں میں ماتم کی دھنیں بجنا شروع ہو جاتیں۔ خوف کا سائرن بجتے ہی خون آلودہ دلوں کی دہشت ناک غمگین لہروں سے سوچوں میں وحشت ناک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ معصوم بچے رات بھر ماں کی چھاتی سے لپٹ جاتے اور والدین ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹنے پر مجبور ہو جاتے۔

برفیلے پہاڑوں کے دامن میں بستی کے بیچوں بیچ کالے دیوؤں کی ویران گھاٹی کے پھاٹک کے سامنے برفیلے گالوں کے درمیان مرے ہوئے کتوں کا عفونت انگیز ڈھیر راہ چل رہے لوگوں پر وحشت طاری کر رہا تھا۔ خون میں لت پت یہ کتے اپنی عادت نہ چھوڑنے پر اپنی جان کھو بیٹھے تھے۔ رات کے اندھیرے میں جب کالے دیو بستی میں گھسنے کی کوشش کرتے تو ان کے ناپاک عزائم کو بھانپتے ہی ان بے زبانوں کا احتجاج شروع ہو جاتا۔ ان بے زبانوں کا احتجاج جب کالے دیوؤں کی ناکامی کا سبب بنتا گیا تو انہوں نے ان کتوں کو بستی والوں کے وفادار محافظ سمجھ کر انہیں ہلاک کرنے کا آپریشن شروع کر دیا اور اس بے زبان مخلوق کی نسل کشی کا سلسلہ شروع ہوا۔

کالے دیوؤں کا یہ منحوس سایہ کئی دہائیوں سے بستی کے اوپر چھایا ہوا

تھا اس جنت نُما بستی کے روح پرور مشک بار ماحول کو ان بدصورت کالے دیوؤں کی بدبودار سانسوں نے پلیگ زدہ بنائے رکھا تھا اوران خبیث روحوں کی جابرانہ موجودگی کی وجہ سے بستی کے عنبر آگیں چمن زاروں، چَھر چَھر کرتے آبشاروں، پُرفریب کہساروں اور حُسن خیز سبزہ زاروں پر منحوسیت کے سیاہ سائے چھائے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں یہ چنڈال فطرت بدصورت مخلوق کن بدتہذیب ویرانوں سے نکل کر ہاتھی کے دانت دکھائے بستی کے ریشم مزاج انسانوں کے سروں پر موت بن کر سوار ہو چکی تھی۔ چمنستان کے باغیرت باغبان لگاتار ان بے غیرت حملہ آوروں کو بھگانے کے وظائف پڑھتے رہتے تھے، پر بستی کا نصیب ہی جانے کہ یہ بدفطرت مخلوق وظائف کے اثر کو بے اثر بنانے کے لئے بستی کے ہی چند کالے بھیڑوں کی ناپاک نفسیات کو اپنے آسیبی حربوں سے متاثر کر جاتے اور وہ کم ظرف شعبدہ باز اپنے کرتبوں سے ان کی موجودگی کو دوام بخشنے کی راہیں ہموار کرنے میں اپنے کرتب دکھاتے رہتے۔

یہ بدفطرت کالے دیو بستی کے کسی بھی گھر میں بے دھڑک گھس جاتے اور اپنی خون خوار آنکھوں کا رعب جماتے ہوئے بستی کے مکینوں کی بے بسی اور بے کسی کے ساتھ جس طرح سے چاہتے کھلی اڑاتے رہتے۔ اگر کوئی انسان اپنی آن بچانے کے لئے ان درندوں سے اُلجھ پڑتا تو ان وحشیوں کے خونخوار پنجے اس مظلوم کو نوچ نوچ کر لہولہان کر جاتے اور ان کے معصوموں کو پلک جھپکتے ہی جھپٹ کر لے جاتے۔ بستی کے لوگ ان آدم خوروں کے

بجائے ان بے زبان کتوں کی وفاداری اور انسان دوستی کے شکر گزار نظر آتے تھے۔ جورات کے گھنے سائے میں اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بستی کے لوگوں کو بھونکتے بھونکتے ان ظالموں کی آمد کا اشارہ کرتے رہتے۔

پھاٹک کے سامنے مارے گئے کتوں کی بدبو سے جب کالے دیو تنگ آگئے تو انہوں نے بستی کے لوگوں کو حکم جابری سنایا کہ وہ ان خون آلودہ کتوں کو اپنے اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر دور کسی نالے میں پھینک دیں۔ بے بس لوگ حکم جابری کی تعمیل کرتے ہوئے کتوں کو کاندھوں پر اُٹھائے جارہے تھے کہ اچانک انہیں مردہ کتوں کے ڈھیر میں ایک خوبصورت نوجوان کی لاش پر نظر پڑی۔ وہ خوف زدہ ہوکر ڈھیر سے پیچھے ہٹنے لگے۔ انہیں پیچھے ہٹتے ہی کالے دیو آگ بگولہ ہوکر چلانے لگے:

''سالے...... ! پیچھے کیوں ہٹے......؟ ان کتوں کو جلدی جلدی یہاں سے ہٹاؤ، ہوا میں بدبو پھیل رہی ہے۔''

''ان...... ان میں ایک انسانی لاش بھی ہے۔'' ایک نوجوان لرزتی آواز میں بول پڑا۔

''اُس کو بھی یہاں سے دفع کرواوران کتوں کے ساتھ کسی نالے میں ڈال دو'' کالی غار سے ایک طنز آمیز آواز آئی۔

''لیکن......!''

''سوال مت کرو، نہیں تو تو بھی کُتے کی موت مرے گا۔ سالا'' ایک اور خوفناک آواز نوجوان کے کانوں سے ٹکرائی۔

کالے دیو ''جشن زیتون'' منانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ بستی کے بچوں کو ہدایت ملی تھی کہ وہ رنگارنگ پروگرام بنانے کے ساتھ ساتھ ''شاخ زیتون'' کے موضوع پر بھی تقریر تیار کریں۔ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ معصوم الوقت نے بھی پروگرام میں شرکت کرنے کا ارادہ کرلیا اور ''شاخ زیتون'' کے فلسفے پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام سامعین سے داد تحسین پائی۔ کالے دیوؤں کا رہبر بھی معصوم الوقت کے امن پسند خیالات سے خوش ہوا اور وہ اپنے امن کے مہان دیوتا کے بنائے ہوئے خوشنما سفید رنگ کبوتر، جس کی چونچ میں ''شاخ زیتون'' رکھی ہوئی تھی، معصوم الوقت کو انعام میں دیتے ہوئے جشن شاستری پڑھنے لگا:

''ہمیں بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ بستی کے نوجوانوں میں امن کی روح جاگ اُٹھی ہے۔ اُن کی آنکھیں روشنی کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ بستی کے اندر اب کسی قسم کا کالا سایہ نظر نہیں آئے گا۔ آپ لوگ صرف اپنی بستی میں زیتون کے پیڑ اُگانے کا وعدہ کیجئے۔''

''جشنِ زیتون'' ختم ہوتے ہی معصوم الوقت خوشنما سفید رنگ کبوتر کو لے کر گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ گھر والوں کو اپنے انعام کی خوشخبری سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ جونہی کالے دیوؤں کی پھاٹک کے قریب پہنچا تو اُسے رکنے کی آواز سنائی دی۔ چند منٹوں کے بعد اُسے دوسرے لوگوں کے ساتھ مردہ کُتے اُٹھانے کا حکم ملا۔ اُس کے انکار کرنے پر کالے دیوؤں کی

آنکھوں میں خون پھیلنے لگا۔ اُس کے ہاتھ میں اپنے دیوتا کے خوش نما سفید رنگ کبوتر کو دیکھتے ہی ایک دیو پوچھ بیٹھا:

''یہ کبوتر تم کو کہاں سے ملا؟''

''جشنِ زیتون والے پروگرام میں شاخِ زیتون سے متعلق میری تقریر سے خوش ہو کر آپ کے رہبر نے مجھے یہ کبوتر انعام میں دے دیا۔'' معصوم الوقت نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیں شاخِ زیتون کا فلسفہ سکھاتا ہے'' یہ کہتے ہوئے کالے دیوؤں نے اُسے مردہ کتوں کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

''نہیں......! یہ سراسر ظلم ہے۔ تمہاری اس وحشت ناک حرکت سے مہان دیوتا کے امن پسند آدیشوں کا خون ہو رہا ہے۔ آپ صفائی کرم چاریوں کی مدد سے ان کتوں کو یہاں سے ہٹا سکتے ہیں۔'' معصوم الوقت کے منہ سے شاخ نبات کے میٹھے میٹھے الفاظ نکل رہے تھے۔

''ہمیں شانتی کا منتر سکھا رہا ہے۔ سالا'' ایک بدصورت دیو اُس پر اپنے خونخوار پنجوں سے وار کرتے ہوئے بول پڑا۔

معصوم الوقت کے جسم سے خون کے فوارے نکل پڑے۔ چند ہی لمحوں کے اندر اندر شاخِ نبات کی مٹھاس اُس کی شریانوں میں زہر بن کر دوڑنے لگی۔ اور مہان دیوتا کا سفید کبوتر جھیل کے سُرخ پانی میں پھڑ پھڑاتے ہوئے سرخ مائل ہوتا گیا۔ کالے بادلوں کی خوفناک بجلیاں چار سو گرجنے لگیں۔ بے بس مخلوق بدحواسی کے عالم میں خون آلودہ کتوں کے ساتھ ساتھ

معصوم الوقت کی خون ٹپکتی لاش کو بھی اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھائے جارہے تھے اور کالی آندھی ان کے شل زدہ کانوں کو کالے دیوؤں کے سرہنگ کا قومی پیغام سُنا رہی تھی:

''اگر جنت کے وارثین، اپنے بچوں کے ہاتھوں میں شاخِ زیتون تھما دینگے تو انہیں شاخ نبات سے نوازا جائیگا۔''

خوف

اُس کے وجود پر خوف کا بھیانک سایہ چھایا ہوا تھا۔ کپکپی طاری ہوتے ہی وہ لاشعوری کے عالم میں تھرتھراتے ہاتھ سے اپنا گال تھام لیتا۔ اُس کی نفسیات پر اس خوف ناک زہریلے جنگلی سانپ کی دہشت اثر انداز ہو چکی تھی۔ خوف نے اُس کی سوچ پر ایک حُلیہ نقش کیا تھا اور جب بھی اس حُلیہ کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرا جاتی تو خوف کا یہ زہریلا جنگلی سانپ اُس کے انگ انگ کو ڈسنا شروع کر دیتا۔

کلاس روم میں ایک مرتبہ ٹیچر نے پانچویں جماعت کے طلاب سے کہا کہ حروف تہجی کے مطابق ہر طالب علم بورڈ پر حرف کے ساتھ تصویر بھی بنائے تو اُس نے حرف ''خ'' سے ''خوف'' لکھا اور سامنے حُلیہ بنا ڈالا۔

ماسٹر جی یہ دیکھ کر ہنس پڑے اور اُسے سمجھاتے ہوئے بولے:-

''بیٹا تم نے ''خ'' کے سامنے پولیس والے کی تصویر بنائی وہاں پر ''ح'' حفاظت کرنے والا لکھو، کیونکہ پولیس والا قانون کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ پولیس کے بغیر سارا امن وامان بگڑ جائے گا اور ہر جگہ قاتلوں اور ڈاکوؤں کا خوف پھیلے گا۔''

خوف کے زہریلے جنگلی سانپ نے اُس کے وجود کو ڈسنا شروع

کردیا۔ تھرتھراتا ہاتھ اُس کے گال کی طرف بڑھنے لگا اور وہ ''حفاظت'' نہیں، ''حفاظت'' نہیں، ''خوف'' خوف چلاتا ہوا کلاس روم سے بھاگ گیا۔ ماسٹر جی اُس کی یہ عجیب حالت دیکھ کر حیران ہوا۔

خوف کے اس زہریلے سانپ نے اُس کے ذہن پر اُس وقت پھن مارا تھا جب کالی رات کے گہرے سایوں کے درمیان بے لگام بندوق کی شعلے برساتی گولیوں نے اس کے والد کی روح کے ساتھ ساتھ قانون کی روح کو بھی ختم کرڈالا تھا اور اس معصوم نے کالا نقاب اوڑھے بندق بردار کی ٹانگ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر روتے روتے پوچھا تھا کہ تم نے میرے ابو جان کو کیوں گولی ماری۔ جواب میں نقاب پوش نے غصے میں آکر اُس کی گال پر ایک ایسا زوردار تھپڑ مارا تھا کہ اُس کے دانت ہل اٹھے تھے۔

سہیل کا والد محمد انور ایک حق پرست اور خوددار انسان تھا۔ ایک میڈیکل ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اپنے مریضوں کو جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ ایمان داری، حق پرستی اور خودداری کے روحانی علاج سے بھی نوازتا رہتا۔ حکیم الامّت علامہ اقبالؔ کا درجہ ذیل شعر ہمیشہ اُس کی زبان پر ہوتا تھا۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

بستی کے لوگ ڈاکٹر محمد انور کی بڑی قدر کیا کرتے تھے اور اُس کی ایمان داری اور خودداری کی مثال دیا کرتے تھے۔ ایک دن پولیس حراست کے دوران بستی کے ایک معصوم نوجوان کی موت واقع ہوگئی۔ پولیس نے

لاش کو سرکاری اسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لئے داخل کرایا۔ ڈاکٹر محمد انور نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا کہ مذکورہ نوجوان کی موت حراستی ٹارچر کے دوراں ہوئی ہے۔ لوگوں کے احتجاجی مظاہروں کی وجہ سے مسئلہ زور پکڑتا رہا۔ جب اوپر سے پولیس پر دباؤ بڑھ گیا تو انہوں نے ڈاکٹر انور کو پوسٹ مارٹم رپورٹ بدلنے پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ کئی دنوں تک جب پولیس کا دھونس دباؤ ڈاکٹر محمد انور کی ایمان داری اور خودداری کے سامنے دم توڑ بیٹھا تو قانون کے محافظ آخر کار اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لئے رات کے اندھیرے میں اُس کے گھر میں گھس گئے۔ انہوں نے جب تلاشی کے بہانے گھر کے زیورات پر ہاتھ ڈالا تو ڈاکٹر محمد انور نے ڈاکوؤں جیسی اس حرکت پر احتجاج کرنا شروع کیا۔ بندوق کے دہانے شعلے برسانے لگے اور دوسروں کی جان بچانے والا ڈاکٹر خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ہیڈ کوارٹر کو میسج دی گئی کہ ملی ٹنٹوں اور پولیس کے درمیان انکاونٹر کے دوران ڈاکٹر محمد انور مارا گیا۔

سہیل جب بڑا ہوا تو خوف کا یہ زہریلا جنگلی سانپ نفرت کا خوفناک اجگر بن چکا تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد پولیس کی ایک خصوصی بھرتی مہم میں سہیل بھی وائرلیس آپریٹر سلیکٹ ہو گیا۔ ٹریننگ مکمل کرنے کے ساتھ ہی اُسے ایس. ایس. پی کے ہمراہ وائرلیس آپریٹر کی حیثیت سے رکھا گیا۔ وہ اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھاتا رہا۔ اس کی شخصیت اگرچہ خودداری کے جوہر سے آراستہ تھی تاہم خوف کے زہریلے جنگلی سانپ نے اس کی سادہ

فطرت کو زہر آلودہ بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔ مظلوم والد نے اُسے ایک ایماندار ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھا تھا لیکن خوف کے کالے ہاتھوں نے انسانیت کا قتل کرتے ہوئے سہیل کے بہتر مستقبل کو بھی قتل کر ڈالا تھا۔ وہ سوچتا رہتا کہ قانون اصل میں اندھا نہیں ہوتا ہے بلکہ روشن قانون کے کالے پاسبانوں کے کالے کرتوت ہی اُسے اندھے قانون کا درجہ دلواتے ہیں اور اُن کے فریب شدہ دعوے ہی ایک تعمیری ذہن کو تخریبی سوچ میں بدل دیتے ہیں۔ سہیل کے ذہن پر کالے پاسبانوں کا سیاہ سایہ اس طرح سے چھایا ہوا تھا کہ اس کی سوچ میں پولیس اور خوف ہم شکل وجود بن گئے تھے۔

خوشگوار فضائیں بدامنی کے منحوس بادلوں کی زد پر تھیں۔ پُرامن ذہن خوف کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہر نئے حادثے کے ساتھ ساتھ سیاسی کرگس میڈیا کے ذریعے لوگوں کو امن واماں قائم رکھنے کی روایتی اپیلیں کرتے اور حادثہ کے ذمہ دار افراد کو سزا دلوانے کے سیاسی وعدے کرتے رہتے۔ عام شہری سیاسی کرگسوں کے ان کھوکھلے وعدوں کی اصلیت جان چکے تھے اور وہ ان وعدوں کو کسی ناکام کمپنی کے پروڈکٹ ایڈورٹائیزینگ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ایس۔ ایس۔ پی کو شہر میں امن واماں بحال کرنے کے سلسلے میں قومی ایوارڈ سے نوازنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارا گھر خوشی سے جھوم رہا تھا۔ ایس۔ ایس۔ پی مبارک بادی کی ہر کال پر بڑے کروفر کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے کارناموں پر فخر کر رہا تھا۔ ایس۔ ایس۔ پی کا لڑکا لیپ ٹاپ پر گیم کھیلنے میں مست تھا۔ ماں نے

دودھ کا گلاس دیتے ہوئے اسے سمجھانے لگی کہ گیم کھیلنے کے بدلے پڑھائی کی طرف دھیان دیا کرتا کہ تو بھی اپنے ڈیڈی کی طرح ایک بڑا عزت دار پولیس افسر بن سکے. بیٹے نے میاں بیوی کو یہ کہتے ہوئے ہنسا دیا کہ ممی زندگی بھی تو اصل میں ایک گیم ہی ہے کبھی گول اُس طرف تو کبھی گول اس طرف اور مجھے صرف ڈاکٹر بننا ہے پولیس افسر نہیں. ڈاکٹر کا لفظ سنتے ہی سہیل کی آنکھیں نم ہوگیں. اسے اپنے معصوم و مقتول والد کی بات یاد آگئی کہ ''سہیل میں تجھے ڈاکٹر بناونگا.'' ایس. ایس. پی صبح سویرے سرکاری ایوارڈ پانے کے لئے فیملی سمت گیٹ پر کھڑی اپنی شاندار گاڑی میں سوار ہوا۔ گاڑی اسٹاٹ ہوتے ہی ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ سہیل کا ایک ہاتھ تھرتھراتے ہوئے اُس کے گال کی طرف بڑھنے لگا اور دوسرے ہاتھ سے وہ وائرلیس پر پولیس کنٹرول روم کو میسیج دینے لگا:

''ملی ٹنٹوں کے ایک خوفناک دھماکے میں ایس. ایس. پی صاحب فیملی سمیت شہید ہوگئے۔''

گمشدہ قبرستان

غروب آفتاب کے ساتھ ہی اُس کی نظریں مشرقی پہاڑی والے درّے پر جم جاتی تھیں۔کالی رات کے سیاہ سائے پھیلنے کے ساتھ ساتھ اُس کی نظروں کے سامنے مایوسی کا غبارہ چھا جاتا اور وہ کھڑکی بند کر کے فریم میں مقید مسکراتے فوٹو کو اپنے سینے سے لگا کر زار و قطار رونا شروع کر دیتی۔جدائی کے کربناک لمحوں کے درمیان ، رات کے سناٹے میں پہاڑی درّے سے صرف ایک ہی دردناک آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی رہتی......میں واپس آونگا......میں واپس آوں گا......

واپس آنے والی یہ پُر اُمید آواز اب نا اُمیدی کا صحرا بن کر سلطانہ کی روح میں سراب بن کر اُتر چکی تھی کیونکہ لمحوں نے اب برسوں کا روپ دھار لیا تھا۔وہ بیوہ کے خوفناک لفظ سے ایسے ڈرتی تھی جیسے کوئی تندرست انسان زہریلے سانپ کے ڈسنے سے ادھ مرا پڑا ہو۔اُس کے زخمی دل کا مرہم صرف ماں کی ایک دُعا تھی......سدا سہاگن رہو بیٹی ......لیکن جب جدائی کے غمگین جذبات کی تیز و تند لہریں دل سے اُٹھ کر اس کی سوچ پر اثر انداز ہو جاتی تو اعتماد کے پہاڑ میں وسواس کا آتش فشاں گرم ہو جاتا اور وہ اُمید کے بھنور میں پھنس کر سوچتی کہ وہ بیوہ ہیں یا سہاگن......؟

سلطانہ کا مسکن سلطان پور تھا۔ سلطان پور، وادی کا ایک خوب صورت گاؤں تھا۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیاں واقع یہ گاؤں ایک تابناک تاریخ کا حصّہ رہا تھا۔ اس کی اپنی ایک شاندار تہذیب تھی، اپنا ایک شاندار تمدن تھا۔ زندگی کی سانسیں خوشگوار ماحول میں چلتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ خوشبودار فضاؤں کے آزاد پنچھی معلوم ہوتے تھے، لیکن ان آزاد پنچھیوں کی آزادی اس وقت چھن گئی جب خوشبودار فضاؤں پر سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلیوں نے آگ کے شُعلے برسانا شروع کردیئے۔ ہر طرف کالا دھواں پھیل گیا اور گھر گھر سے ماتم کی دھنیں بجنے لگیں۔

برسوں پہلے سلطان پور کے بلند پہاڑوں سے کالی بلاؤں کا ظہور ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان خوفناک بلاؤں نے طاقت کے بل پر سلطان پور کو اپنے خونین شکنجے میں اس طرح سے کس لیا کہ ہنستے مسکراتے چہرے مرجھے مرجھے سے نظر آنے لگے۔ دہشت کی وجہ سے ہر انسان نفسیاتی مریض بنتا گیا اور گلستان قبرستان بنتے گئے۔

گاؤں کے اسی پُر آشوب ماحول میں سلطانہ جوان ہوگئی۔ رشتے آنے لگے، مشورے ہوتے رہے اور آخر کار سلطانہ کا رشتہ گاؤں کے ایک ایسے خوب رو بہادر نوجوان سے طے ہوا جو نام کا ہی نہیں بلکہ دل کا بھی سلطان تھا۔ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ صالح فطرت بھی تھا اور ہر کسی کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتا تھا۔ ایک دفعہ جب گاؤں کے ایک غریب کسان کی گائے مرگئی تو غریب کسان کے گھر سے آہیں اور سسکیاں اُٹھنے

لگیں۔ سلطان سے غریب کا یہ صدمہ برداشت نہ ہوا اور اُس نے گھر کی گائے بلا معاوضہ غریب کسان کو دے دی۔ کُشتی میں اُسے کوئی بھی پچھاڑ نہیں سکتا تھا اور کبڈی کے کھیل کا تو وہ چمپئن ہی تھا۔ کھیتی باڑی اُس کا پیشہ تھا۔ وہ سال بھر اپنے ہی کھیت کھلیانوں میں محنت مزدوری کر کے روزی روٹی کماتا تھا۔ گاؤں کی اکثریت بھی زراعت کے پیشے سے ہی وابستہ تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد اگرچہ کم تھی تاہم گاؤں کے اکثر بچے اب اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ایک صبح تمام گاؤں والوں کو کڑکتی سردی میں گھروں سے باہر نکالا گیا اور ایک بڑے میدان میں یخ بستہ برف کے اوپر بٹھایا گیا۔ چار جانب ہتھیار بند پھیلے ہوئے تھے۔ خوف و دہشت کی بلاؤں نے ہاہا کار مچاتے ہوئے نوجوانوں کو چن چن کر اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ ان کے کپڑے اُتار اُتار کر انہیں ننگے بدن پیڑوں سے باندھا گیا۔ ٹارچر شروع ہو گیا۔ چیخ و پکار سے پیڑوں پر بیٹھے پرندے بھی سہم گئے۔ سلطان کو بھی پیڑ پر اُلٹا لٹکایا گیا اور درجن بھر بندوق بردار اُس پر ٹوٹ پڑے۔ گاؤں کے بے گناہ نوجوانوں کو بے رحمی سے مارتے مارتے دیکھ کر گاؤں والے شور مچانے لگے۔ جرأت کا مظاہرہ کر کے سلطانہ اندھی بندوق کے سامنے کھڑی ہو گئی اور ظالموں کے ہاتھوں سے سلطان کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی۔ کمانڈر نے پُر رُعب آواز میں اسے پیچھے ہٹنے کو کہا۔

”آپ لوگ بندوق کا رعب جما کر انہیں کیوں ظلم کا نشانہ بنا رہے

ہو۔'' سلطانہ احتجاج کرتے ہوئے بول پڑی۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ گاؤں کے نوجوان دہشت گردوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔''

''دہشت گرد......کون......؟'' سلطانہ کا پارا چڑھنے لگا ''جنہوں نے طاقت کے بل بوتے پر گھسیٹ کر ہمیں یہاں لایا۔''

''ہمارے کام میں دخل مت دو۔'' کمانڈر نے گالی دیتے ہوئے اُسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

سلطانہ نے بھی جذبات میں آکر اُس کے منہ پر کرارا تھپڑ مارا۔ لوگ بھی زور دار احتجاج کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے اور بندوق بردار گرم ماحول دیکھ کر وہاں سے فرار ہوگئے۔

شادی کا دن تھا۔ سلطانہ کو بڑے دھوم دھام سے سُسرال لایا گیا۔ نصف رات کے وقت اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور آناً فاناً نقاب پوش افراد کی ایک ٹولی گھر کے اندر گھس گئی۔ سلطان کے ساتھ ساتھ دوسرے افراد خانہ کو بھی بندوق کی نوک پر گھر سے باہر نکالا گیا۔ سلطانہ کو کمرے میں ہی بند کیا گیا۔ سلطان کے ہاتھ رسیوں سے باندھے گئے۔ ہر طرف خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ سیاہ بادلوں کی کڑکتی بجلی نے پھولوں کی سیج کو بھسم کر ڈالا۔ جمہوریت کے ایوان ہلنے لگے۔ وحشی کی جھپٹ سے مظلوم ہرن کی پُردرد چیخ اندھیرے میں گونج اُٹھی۔ سلطان ظالموں کے شکنجے کو توڑ کر کمرے کی جانب دوڑ پڑا۔ سلطانہ بستر پر بے حس پڑی تھی۔ سلطان نے درندے

کے ہاتھ سے بندوق چھینی اور گردن پکڑ کر اُسے گھسیٹتے ہوئے مکان سے باہر لایا۔ نقاب پوش سلطان پر ٹوٹ پڑے اور اسے زنجیروں میں جھکڑ کر پہاڑی کی طرف چل پڑے۔ سلطانہ ٹوٹے قدموں سے کھڑکی پر کھڑی ہوگئی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پہاڑی درّے سے صرف ایک آواز آرہی تھی، سلطانہ میں واپس آونگا...... میں واپس آونگا۔

گزرتے وقت کے کرب انگیز لمحوں نے سلطانہ کے دل ودماغ کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ امید کے ہرے بھرے پتے زرد ہوتے جارہے تھے۔ عید کا چاند نکل آیا تھا۔ خوشی کے ان لمحات میں بھی سلطانہ کی سوچ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے ساتھ ہی وہ بستر پر لیٹ گئی۔ آنکھ لگتے ہی اُسے خواب میں سطان نظر آیا جو باہیں پھیلا پھیلا کر کہہ رہا تھا:

''سطانہ کل مجھ سے ملنے آنا، ہم پھر سے ملیں گے۔ اب ہمیں کوئی ظالم جُدا نہیں کرسکتا۔''

سلطانہ کی نیند اچانک ٹوٹ گئی۔ وہ کھڑکی کھول کر پہاڑ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ مایوس ہوکر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس نے آنکھیں تو بند کرلی لیکن نیند کوسوں دور بھاگ چکی تھی۔ صبح تک اس کی آنکھوں میں عجیب وغریب مناظر آتے رہے۔ عید کی گہما گہمی چارسو پھیلی ہوئی تھی۔ سلطانہ کے قدم نا چاہتے ہوئے بھی قبرستان کی جانب بڑھنے لگے۔ قبرستان پچھلی دودہائیوں سے سینکڑوں مظلوموں کو اپنی گود میں سُلاتا آیا تھا۔ قبرستان میں پہنچ کر سلطانہ کو ایک سبز رنگ کا کتبہ نظر آیا۔ کتبے پر

''گمشدہ قبرستان'' لکھا ہوا تھا۔ یہاں کشمیر کی گمشدہ نسل دفن تھی۔ گمشدہ قبرستان ایسی ہزاروں گمنام قبروں کا مسکن تھا جس میں عدمِ تشدد کا فلسفہ جمہوریت کا کفن اوڑھے ہوئے دفن تھا۔ قبرستان مظلوموں کی آہوں اور سسکیوں سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ کوئی ماں اپنے گمشدہ بیٹے کو ڈھونڈ رہی تھی اور کوئی معصوم بچہ اپنے گمشدہ باپ کی قبر تلاش کر رہا تھا، لیکن کسی کے ہاتھ مایوسی کے سوا کچھ بھی نہ آتا تھا۔ چار سو حشر کا سماں بپا تھا۔ اس حشر نما عالم میں سلطانہ کے ٹوٹے قدم ایک گمنام قبر کے نزدیک خود بہ خود رُک گئے۔ وہ قبر کو غور سے دیکھنے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قبر اسے کہہ رہی ہے کہ سلطانہ تیرا سلطان میری گود میں سو رہا ہے۔ ظالموں نے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے حوالے کر دیا تھا۔ سلطانہ لرزتے وجود کے ساتھ وہاں سے چیختی چلاتی گھر کی جانب دوڑ پڑی، نہیں ایسا نہیں ہوسکتا...... ایسا نہیں ہوسکتا......! کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے سلطان کا فوٹو سینے سے لگا یا اور خون کے آنسوں بہانے لگے۔

رات کے سیاہ سائے دن کے اُجالے پر چھا جانے لگے۔ ہتھیاروں سے لیس درجن بھر نقاب پوش گھر کے اندر نمودار ہو گئے۔ گھر کے اندر سناٹا چھا گیا۔ خوف کے مارے سلطانہ کا دل بیٹھنے لگا۔

''تم نے ہمارے خلاف کیوں ہیومن رائٹس کمیشن میں کیس دائر کر دیا ہے؟'' کالا افسر دانت دکھاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''کہاں ہے میر اسلطان؟'' سلطانہ سہمی سہمی آواز میں بول

پڑی ''مجھے میرا سلطان لوٹا دو۔''

''وہ دہشت گردوں کے ساتھ کام کرتا ہے۔'' وہ پھنکارتے ہوئے بول پڑا۔ ''تم اس کاغذ پر انگوٹھا لگاؤ۔''

''مجھے میرا سلطان واپس لا کر دو۔'' سلطانہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل پڑی ''تو ہی میں سفید کاغذ پر انگوٹھا مارونگی۔''

ظلم کی ننگی تلوار ہوا میں رقص کرنے لگی۔ سلطانہ کے دل سے خون کا فوّارہ پھوٹ پڑا۔ سرخ خون سے سفید کاغذ پر انگوٹھا لگ گیا۔ جدائی کی آخری سانسیں دم توڑنے لگیں۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کھڑکی کے پٹ کُھل گئے۔ سلطان پور کے گھر گھر سے ماتم کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ کالی بلاؤں کے خونین پنجوں نے گلستان کے رنگ برنگے پھولوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ سلطانہ کی آس بھری نظریں پہاڑی کے اُس درّے پر جم چکی تھیں جہاں بھیانک اندھیرا تھا...... صرف بھیانک اندھیرا!

☆☆☆

زہریلے ناخدا

اُس کی جوانی ...... زندگی اور موت کی آخری کشمکش میں مبتلا تھی۔ اسپتال میں خود کو پا کر اُسے یک گونہ سکون محسوس ہوا لیکن جسم میں پھیل رہے زہر کو وہ کیسے روک پاتی۔ وہ حادثات اُس کے ذہن میں گردش کرنے لگے جن کی وجہ سے آج وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ وہ ایک غریب دیہاتی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ باپ کی محنت مزدوری سے گھر کا چولہا گرم رہتا تھا۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھی تھیں، جو خزاں سے بھی بدتر تھیں۔ وہ ایک دور افتادہ گاؤں کا باشندہ تھا جو شہر سے تقریباً دو سو میل کی دوری پر واقع تھا۔ اُس دیہات میں جدید زمانے کی جدید سہولیات تو کیا زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہ تھیں۔ نہ بجلی کا کوئی انتظام اور نہ ہی طبی سہولیات! گاؤں میں کوئی اسکول نہ ہونے کی وجہ سے بستی کے بچے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی دور کے ایک سرکاری اسکول میں پڑھائی کے لئے پیدل جاتے تھے اور غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے گھروں میں واپس لوٹ آتے۔ الیکشن کے فریبی موسم میں بہت سارے سیاسی گدھ ان پسماندہ دیہات میں نمودار ہوتے تھے اور ان لوگوں کے مشکلات کو دور کرنے کے وعدے کرتے رہتے لیکن الیکشن جیتنے کے بعد وہ

صرف اپنے مشکلات کو ہی حل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ۔ اس اندھیرے میں بھی اکبر خان نے خون پسینہ ایک کر کے اپنے لڑکے جاوید کو گریجویشن تک پڑھایا اور اپنی بیٹی حسینہ کو بھی گریجویشن کرنے کے لئے شہر کے ایک کالج میں ایڈمیشن کروایا تھا۔

جب جاوید سرکاری محکمہ میں بحیثیت کلرک ملازم ہوا تو اکبر خان نے راحت کی سانس لی۔ کچھ مہینے بڑے سکون سے گزر گئے کہ اچانک ایک دن اکبر خان کے گھر والوں کو یہ منحوس خبر ملی کہ جاوید دفتر سے لوٹتے وقت شہر میں ہوئے ایک بم دھماکے کی زد میں آکر اپنی جان کھو بیٹھا۔ اکبر خان کے گھر کے ساتھ ساتھ سارے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔ اکبر خان کی نئی بہار کو خزاں نے دبوچ لیا۔

دھماکے میں مارے گئے معصوم شہریوں کے حق میں سرکار کی طرف سے ایک لاکھ روپے کے ساتھ ساتھ گھر کے ایک فرد کو سرکاری نوکری دینے کا بھی اعلان ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ جاوید کے کیس کی فائل دوسری سینکڑوں فائلوں کی طرح سرکاری محکموں میں گرد چاٹتی رہی۔ سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے ایک رات جب اکبر خان مایوسی اور نا اُمیدی کی حالت میں گھر واپس لوٹا تو حسینہ باپ کی اندرونی حالت بھانپ گئی۔ موقع پاتے ہی وہ پوچھ بیٹھی:

”بابا! کیا بات ہے؟ آپ کیوں پریشان سے نظر آرہے ہیں۔ جاوید کے کیس کا کیا ہوا؟“

"بیٹی ...... تم تو جانتی ہو کہ جاوید کی فائل کمشنر کے آفس میں پڑی ہے۔فائل کو آگے بڑھانے کے لئے کیس کا انچارج آفیسر ریلیف کی نصف رقم ایڈوانس مانگ رہا ہے۔بیٹی گھر میں پھوٹی کوڑی بھی موجود نہیں ہے۔یہ لوگ انصاف کی کرسیوں پر بیٹھ کر مردہ انسانوں کے گوشت کو ٹکڑوں میں کھاتے رہتے ہیں۔"

حسینہ یہ سُن کر پریشان ہوگئی۔اُس نے سوچا کہ اس ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھانا ضروری ہے آخر قانون بھی تو کوئی چیز ہے، میں کل ہی شہر چلی جاؤنگی۔شہر میں پریس ہے، میڈیا ہے، N.G.O's ہیں۔وہاں میں بے بس انسانوں پر ہورہے ظلم کے بارے میں ہر جگہ اپنی آواز پہنچا سکتی ہوں۔دوسرے دن حسینہ شہر کی جانب چل پڑی۔شہر پہنچ کر اُس نے انصاف کو پانے کے لئے ہر ادارے کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کردیا۔ایڈیٹر کو ایک دلدوز کہانی مل گئی اور میڈیا کو سنسنی خیز نیوز۔N.G.O's کو احتجاج کرنے کے بہانے مل گئے اور سیاسی لیڈروں کو اپنی سیاست کی دکان چمکانے کے لئے ایک اور قیمتی ایٹم مل گیا۔ایک دن منسٹر کے پرنسل سیکورٹی آفیسر کی وساطت سے حسینہ کو اُس منسٹر تک اپنی آواز پہنچانے کا موقع ہاتھ آیا۔دو تین مہینے شہر میں گزارنے کے بعد حسینہ گھر واپس لوٹ آئی۔بوڑھے ماں باپ اُس کی راہ تک رہے تھے۔بیٹی کو دیکھ کر دونوں کے چہرے تمتما اُٹھے۔چائے وغیرہ پینے کے بعد اکبر خان نے بے قراری کے عالم میں اُسے پوچھا۔

"بیٹی...... معاملہ کہاں تک پہنچا۔منسٹر صاحب نے جاوید کے کیس

کے بارے میں کیا کہا؟ اور تمہاری نوکری......!''

حسینہ باپ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''بابا...... فریبی ماحول میں بغیر معاوضہ کے کوئی کام نہیں نکلتا ہے ۔میرا آڈر تقریباً تیار ہے۔''

والدین کو اس بار بیٹی کی آواز میں بڑی اُمید نظر آرہی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ شاید راحت کے دن پھر سے لوٹ آئینگے۔ آخر وہ دن آہی گیا جب منسٹر ہزاروں لوگوں کے جلسے میں غریبوں کا مسیحا بن کر تشدد میں مارے گئے افراد کے لواحقین کو نوکریوں کے آرڈر بانٹ رہا تھا۔ آخر پر حسینہ کی نوکری کے آرڈر کا اعلان ہوا۔ حسینہ منسٹر کے ہاتھ سے آرڈر لیتے ہوئے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اُسے اسپتال پہنچایا گیا۔ میڈیکل ٹریٹمنٹ کے بعد جب اسے ہوش آیا تو اس کی آنکھیں ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بیڈ کے اردگرد ایڈیٹر، پولیس آفیسر، N.G.O's چلانے والے اور نسٹر سب کھڑے تھے۔ چہروں سے فریبی نقاب سرک رہے تھے۔ چہروں کے وحشتناک سائے حسینہ کی نفسیات پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ وقت کے کرب انگیز طوفان میں خوابوں کی کشتی ہچکولے کھا رہی تھی۔ زندگی کی پتوار ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ حسینہ سوچ رہی تھی کہ ساحل کی تمنا میں انسان جب گرداب میں پھنس جاتا ہے تو ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ حسینہ کے سینے سے درد کی ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ چھوٹے بھائی کی روتی بلکتی آواز سے اس کی نیم مردہ آنکھیں وا ہوئیں۔ بھائی کی طرف دیکھتے

ہی بیٹی کی پُر درد آواز بے بس باپ کے بہتے آنسوؤں کو دلاسہ دینے لگی:

''بابا...... بابا...... سب مدد گار زہریلے ناخدا نکلے ...... مُنا کو انسان بنانا صرف انسان......!''

سفید تابوت

کالی کوٹھری کے اندھیرے تہہ خانے میں وہ جب اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی کوشش کرتا تو اندھیرے عالم کے خوفناک مناظر اس کی نیند پر شبخون مارنا شروع کر دیتے اور اس کے ذہن میں شعور، لاشعور اور تحت شعور کے بکھرے خیالات کے درمیاں تصادم شروع ہو جاتا۔

بھیانک خوابوں کے وحشت ناک سائے اس کے دل کی دھڑکن میں ابال لاتے اور وہ ہڑبڑاتے ہوئے بستر سے اُٹھ بیٹھتا۔ اس کی سانس پھول جاتی اور وہ رات بھر دیوار سے ٹیک لگائے خون بار آنکھوں سے تہہ خانے کی زنگ آلودہ آہنی سلاخوں کو دیکھتے رہ جاتا۔ اندھیرے عالم کے وحشت ناک مناظر، اس کے لئے سوہانِ روح بنے ہوئے تھے۔ کالی بلاؤں کی خوفناک چیخیں، مردہ خور کرگس کی سرخ رنگ چونچیں، کینچلی بدلتے رہتے کالے ناگوں کی پھن مارتی کُنڈلیاں، جنگلی پاگل کتوں کی لال ٹپکتی زبانیں اور سفید تابوتوں کی یورش کے درمیان خوش نما عقابوں کی پروازیں......!!!

لمبے عرصے سے اُس کی بے قرار آنکھیں کسی معبّر کی راہ تک رہی تھیں تا کہ ان خوفناک خوابوں کی تعبیر پا کر وہ اپنے بکھرے وجود کو سمیٹ سکے۔

ایک رات...... ہاں ...... ایک خوش نصیب رات، وہ معبّر کو پانے میں

کامیاب ہوگیا۔ اس کی سوچ، شعور سے لاشعور اور لاشعور سے تحت شعور کے گہرے سمندر کی تیز رفتار موجوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی۔ تحت شعور کی تیز رو نے اُسے وقت کے اُس نورانی ماحول میں پہنچادیا جہاں معبّروں کی روشن قندیلیں نور بکھیر رہی تھیں۔ وہ معبروں کی سماعتوں کے حوالے اپنے پراسرار خوابوں کی دُکھ بھری کہانی کرتا رہا اور معبّر بڑی خاموشی سے درد بھرے سمندر کا مشاہدہ کرتے رہے۔

کئی درد بھرے شب گزر گئے۔ وہ بڑی بے چینی کے ساتھ تعبیر کا منتظر رہا۔ اچانک ایک خوبصورت چاندنی رات کے درمیان اُسے اندھیرے تہہ خانے میں چلنے کی آہٹ سنائی دی۔ اُس پر انجانا سا خوف طاری ہوگیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ چند لمحوں کے اندر اندر کسی پتھر کے گرنے کی سی آواز سنائی دی اور آہٹ کی سنسناہٹ بند ہوگئی۔ وہ نیند بھری آنکھوں سے گرنے والی شئے کو اندھیرے میں ٹٹولنے لگا۔ اُسے ایک صندوق نما شئے سے ٹھوکر لگی۔ ٹھوکر لگنے کے ساتھ ہی اُس کا ہاتھ صندوق کے تالے پر پڑ گیا۔ اُس کو ایک جھٹکا سا لگا اور صندوق کا ڈھکن کُھل گیا۔ صندوق سے ایک تیز روشنی نکلی، جس سے تہہ خانے کے در و دیوار روشن ہوگئے۔ وہ بڑے غور سے صندوق کا جائزہ لینے لگا۔ صندوق کے بدلے یہ سبز رنگ تابوت تھا۔ تابوت میں ایک خوش رنگ موٹی کتاب تھی جس پر سنہرے حروف سے ''تعبیر نامہ خواب'' لکھا ہوا تھا۔ اُس کے تھرتھراتے ہاتھ کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ وہ اپنے ہر خواب کی تعبیر پاتا گیا۔ رات کے آخری پہر اُس نے جونہی

سبز رنگ تابوت کو کاندھوں پر اُٹھایا تو شدید زلزلے کی وجہ سے اندھیرے تہہ خانے کے درودیوار میں شگافیں پڑنے لگیں۔ روشنی کی کرنیں کالے اندھیرے کو چیرتی ہوئی فضائے بسیط میں پھیلنے لگیں۔ اُس کے مضبوط کاندھوں پر سبز رنگ تابوت دیکھ کر سبز رنگ عقاب جھنڈ کی صورت میں فضائے بسیط میں اُڑان بھرنے لگے۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور عقاب بھی اُس کی رفتار کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے گئے۔

اُس کی تیز رفتاری نے اُسے اُس کے خوابوں کی سنہری وادیوں میں پہنچادیا۔ سنہری وادیوں کی اپنی ایک شاندار تہذیب تھی، اپنا ایک شاندار تمدّن تھا۔ اس شاندار تہذیب وتمدّن کے روشن میناروں نے دنیا کی اندھیرے غاروں میں روشنی کی کرنیں پھیلائی تھیں اور جاہلیت کے اندھیرے غاروں میں بسنے والے مچھلی فروشوں کے کالے دماغوں میں نور کی کرنیں بھردی تھیں۔ ان نورانی کرنوں کی بدولت ہی وہ قزاق فطرت بنجر ذہن اپنی ناتواں سوچ میں تہذیب وتمدّن کی سر سبز وشاداب دنیا بسانے کے لئے آمادہ ہوگئے تھے۔

وقت کا دریا بہتا رہا۔ موسموں کی گردش جاری رہی۔ سنہری تہذیب وتمدّن کی وادیوں سے بہار کی رونق ختم ہونے لگی۔ ہیرے کی کانوں میں کوئلوں کے ڈھیر جمع ہونے لگے۔ متحرک سوچوں پر جمودی افکار چھانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے وقت کے تیز بہاؤ نے تہذیب وتمدّن کی ان سنہری وادیوں کو ماضی کا حصہ بنادیا۔ نئے زمانے کی ہوائیں چلنے لگیں۔ موسم نئی نئی

بہاروں کو اپنے ساتھ لاتا گیا۔ سنہری وادیوں کے ماضی اسیر پرندے آنکھیں بند کر کے اپنی چونچ اپنے پروں میں چھپائے گہری نیند میں کھو گئے۔ ان کی سنہری وادیوں پر خزان کے سائے چھا گئے اور ان کے شاندار تہذیب وتمدن کو نئے بہاروں کے کرگسوں نے اپنا لیا۔ ان کرگسوں کے بے جان پروں میں جونہی اُڑنے کی طاقت آ گئی تو ان کی قزاق فطرت نے اپنی خصلت دکھانا شروع کر دی۔ یہ مردہ خور کرگس سنہری وادیوں پر اپنا منحوس سایہ ڈالنے کے لئے پر تولنے لگے اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ مردہ خور کرگس ان کے گلستان میں آزادنہ اُڑانیں بھرنے لگے۔ انہوں نے جب اپنی بدبودار سانسوں سے گلستانوں کی معطر فضاؤں کو آلودہ کرنا شروع کیا تو سنہری وادیوں کے بے خود پرندوں کی آنکھیں کُھلنے لگیں۔ وقت کا دریا تیزی کے ساتھ بہتا رہا۔ لمحوں نے صدیوں کا روپ دھار لیا۔ نئے دور کے نئے موسموں میں سنہری وادی کے بے ہوش پرندے اب ہوش میں آنے لگے۔ وہ اپنے گمشدہ تہذیب وتمدن کو دوبارہ پانے کی جستجو کرنے لگے اور ان مردہ خور کرگسوں سے اپنے گلستانوں کو پاک کرنے کے لئے دھیمی دھیمی اُڑانیں بھرنے لگے۔

مردہ خور کرگسوں کو جب اپنی آزادانہ اُڑانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے پرندوں کی اُڑانیں نظر آنے لگیں۔ تو ان قزاق فطرت مردہ خور کرگسوں سے یہ اُڑانیں برداشت نہ ہوسکیں۔ وہ اپنے خون پسند چونچوں سے ان پرندوں کے پر نوچنے لگے۔ ان کی چیر پھاڑ سے فضا میں خون کی بُو پھیلنے

لگی۔ کئی پرندے ناتواں بنا دیئے گئے۔ کرگسوں کی اس دہشت انگیز خصلت نے ریشم فطرت پرندوں کو عقابی خصلت اپنانے پر مجبور کر دیا۔ فضائے بسیط میں خونین جھپٹ پلٹ شروع ہوگئی۔ کرگسوں کی حمایت میں رال ٹپکتے جنگلی پاگل کُتے اور کینچلی بدلتے کالے ناگ بھی سامنے آگئے۔ سبز رنگ عقابوں کے جاں فشاں حملوں سے مردہ خور کرگسوں اور ان کے حواریوں کے دل بیٹھنے لگے اور وہ نفسیاتی شکست سے فریسٹریشن کے شکار ہونے لگے۔ عقابوں کے جوابی حملوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی حیوانیت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے مردہ خور کرگسوں نے عقابوں کے نشیمنوں میں زہریلی سانسیں چھوڑنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ زہریلی سانسیں جب کسی نشیمن میں داخل ہوجاتیں تو بڑے عقابوں کے ساتھ ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو بھی آن کی آن میں موت کے گھاٹ اُتار دیتی۔ ان وحشی حربوں سے بھی جب سبز رنگ عقابوں کے حوصلے پست نہ ہوئے تو مردہ خور کرگسوں کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ کیونکہ یہ مردہ خور کرگس نہ صرف عقابوں کے پُرتاثیر تالابوں سے اپنی ہوس کی پیاس بجھاتے تھے بلکہ ان کے گلستانوں کی زرخیز مٹی کے پوشیدہ سنہرے بیجوں کو بھی اپنے قزاقی پیٹ میں ہضم کر جاتے۔ ان مردہ خوروں کی استحصالی فطرت کو ختم کرنے کے لئے جب عقاب موت بن کر ان کے سروں پر چھا جانے لگے تو ان کو عقابوں کے گلستانوں پر اپنی حیوانی گرفت کا دائمی خواب چکنا چور ہوتے ہوئے نظر آنے لگا۔

مردہ خور کرگسوں اپنی استحصالی فطرت کو دوام بخشنے کے لئے بدلتے

موسموں کے ساتھ ساتھ نت نئے حربے استعمال کرتے گئے۔ اپنے حواریوں سے صلح مشورہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک پُر فریب پالیسی اپنائی اور پرندوں کی ذات سے چند بجو کا صورت پرندوں کو ان کے گلستان کا مالی بنا ڈالا لیکن عقاب جب اس سازش سے بھی اپنے جاں فشاں حملوں سے باز نہیں آئے تو انہیں قابو کرنے کے لئے مردہ خوروں نے اپنا آخری سخت ترین داؤ کھیلا۔ یہ آخری داؤ سفید تابوتوں کی یورش تھی۔ سفید تابوتوں کی یورش نے گلستانوں پر زلزلہ طاری کر کے عقابوں کے ٹھکانوں کو زمین بوس کرنا شروع کر دیا۔ سینکڑوں عقابوں کی جلی کٹی لاشوں کے خونین مناظر نے زندہ عقابوں پر وحشت طاری کر دی۔ ان کے گلستان ویران ہوتے گئے۔...... برباد ہوتے گئے۔

وہ عقابوں پر چھائی جا رہی وحشت کو بھانپ گیا۔ اُس کا غم زدہ ذہن سفید تابوتوں کی خونین صلیب توڑنے کے بارے میں سوچ کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اس کا شعور، لاشعور اور تحت شعور ایک ساتھ جاگ اُٹھا۔ کاندھے پر اُٹھائے ہوئے سبز رنگ تابوت کو فلک بوس پہاڑ پر رکھتے ہی عقابوں کے جُھنڈ اُس کے ارد گرد طواف کرنے لگے۔ سبز رنگ تابوت کا ڈھکن اُٹھتے ہی ''تعبیر نامہ خواب'' کے سنہرے اوراق فضا میں پھیلنے لگے۔ اوراق اُڑنے کے ساتھ ہی سبز رنگ تابوت فضائے بسیط میں گھومنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے عقابوں کے جُھنڈ اپنی چونچ میں تعبیر نامہ خواب کے اوراق لے کر مردہ خور کرگسوں پر جھپٹ پڑے۔ کرگسوں کے سفید تابوت عقابوں کے سبز تابوتوں

سے ٹکرانے لگے۔ پہاڑوں کے خاموش آتش فشاں ابلنے لگے اور ان کے پھٹتے ہی زمین کا وجود ہلنے لگا۔ سمندر کی سونامی لہروں نے جب ساحلوں کو عبور کرتے ہوئے قزاق فطرت مردہ خور کرگسوں کے ٹھکانوں پر بھی حملہ کردیا تو مردہ خور کرگس اپنے بزدل حواریوں سمت حواس باختہ ہو گئے۔ طوفانی لہروں کے خوف نے اُن کی خون آلودہ چونچوں کو شل کردیا۔ اور انہوں نے عقابوں کے گلستانوں سے فرار کا راستہ اختیار کرتے ہوئے سفید کبوتروں کو عقابوں کے جُھنڈ کی طرف روانہ کردیا۔ سفید کبوتر اپنی چونچ میں شاخِ زیتون لے کر عقابوں کے گلستانوں میں داخل ہو گئے۔ عقابوں کے گلستان کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے مردہ خور کرگسوں کی شکست کا اعلان کردیا اور شاخِ زیتون سے امن کا نقارہ بجانے لگے۔

نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ سفید تابوت کی صلیب ٹوٹ چکی تھی۔ مردہ خور کرگسوں کی خون آلودہ چونچ پر زہریلا زنگ لگنے کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے گلستانوں کی شادابی کا نظارہ کر رہا تھا۔ ان کی خوشبودار ہواؤں سے سرشار ہو رہا تھا۔ پرندے پُرمسرت بہار میں چہچہار ہے تھے۔ وقت کے دریا کا بہاؤ ماضی کو چھوڑ کر مستقبل کی جانب بڑھ رہا تھا۔

عقاب...... اپنی سنہری وادیوں کے سرسبز و شاداب گلستانوں کی آزاد فضاؤں میں فخر احساس اُڑانیں بھر رہے تھے اور ان کی بلند پروازی کی متحدہ صدائیں فضائے بسیط میں گنگنا رہی تھیں۔

ہم نے توڑی روایات کی زنجیر سُنو
اِک نئے دور کا آغاز ہوا ہے ہم سے
(فرقت کیفی)

بہشت کی پکار

شب تاریک جب اپنے بھیانک سایوں سے وادی بہشت کے طول وعرض کو ڈھانپ لیتی تو وادی امان ہو کے عالم کی اسیر ہو جاتی ۔ بھیانک سائے کے خوف و ڈر سے پیدا شدہ عجیب وغریب قسم کی چیخ وپکار اونچے اونچے مضبوط پہاڑوں پر بھی زلزلہ طاری کر دیتی اور یہ دل خراش چیخیں جب پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آتی تھیں تو باشندگانِ بہشت کے خوف زدہ دل و دماغ پر اور بھی دہشت طاری کر دیتی۔ قابض خونخوار بھوت پریتوں نے وادی بہشت کے چپے چپے کو اپنے خون ریز آہنی پنجوں سے دبائے رکھا تھا۔ بہشت کے اسیر وارث، جن کی ذہانت کا اعتراف زمانہ صدیوں سے کرتا آیا تھا، ظلم سہتے سہتے فریسٹریشن کے شکار ہو چکے تھے۔ برسوں سے وہ پرسکون آرام کے لئے ترٹپ رہے تھے۔ ان کی نیند بھری آبدیدہ نگاہیں ایک زمانے سے تربتر تھیں۔ یہ ستم زدہ لوگ ہکلاتی زبان سے کاتب تقدیر سے التجاء کرتے رہتے کہ " اے کاش ! ہماری نئی نسل کو پرندوں کی جون میں بدل دے تاکہ وہ ان درندوں کے ظلم وستم سے نجات پاسکے اور مستقبل کی آزاد فضاؤں میں آزادی کے ساتھ پرواز کر سکے۔" یہ لوگ جب راحت پانے کے لئے سونے کی کوشش کرتے تو ڈراونے خواب ان کی نیند پر شب خون مار

کرانہیں نیم خوابی کے بھنور میں چھوڑ جاتے اور لحاف کا سفید کپڑا انہیں اپنے اپنے کفن دکھائی دیتے۔

اسیر زدہ وادی بہشت کا وہ نیم بسمل شکار، جب اپنی زخمی روح کو سکون دینے کے لئے نیند کی آغوش میں لے جانے کی کوشش کرتا تو خونین جھیل کے سُرخ پانی کے اوپر تیرتی ہوئی خون آلودہ لاشوں کا خوفناک منظر اس کے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا۔ وہ اس اضطراری کیفیت میں اپنے کانپتے وجود کے ساتھ سویرے کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہتا...... لیکن...... وہ سویرا...... جس کا اسے انتظار تھا...... آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی کہیں سے بھی نمودار نہیں ہو رہا تھا۔ زندگی کی یہ آدھی صدی اُس نے بہشت میں ہونے کے باوجود بھی جیسے جہنم میں گزاری ہو۔ خونین جھیل کی تیرتی لاشوں کے خوفناک منظر نے ایک بار پھر اُس کی نیند کو توڑا اور وہ حسب عادت رات کے اندھیرے میں مکان کی چھت کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چھت پر پہنچ کر اُس نے وادی کے چاروں اور نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور کُھلے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کا بدن خوف سے کانپ رہا تھا۔ ہر طرف کرب انگیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان کے اُبھرتے ڈوبتے ستاروں کا منظر اُسے کبھی خوش اور کبھی غمگیں کر دیتا۔ اُس کا ذہن خوشی اور غم کے اس چکرویو میں ابھی پھنسا ہوا تھا کہ اچانک گہرے بادلوں کے کالے گولے فضا میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ اس ٹکراؤ نے بجلیوں کا روپ دھار لیا

اور کڑکتی بجلیوں نے وادی بہشت کو اپنی زد میں لایا۔ بہت سارے خوش رنگ پھول راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ طوفانی ہواؤں نے ہر طرف تباہی مچانا شروع کردی۔ وہ خوف زدہ ہوکر کافی دیر تک اپنے مقدر پر روتا رہا۔ جب طوفان تھوڑا سا تھم گیا تو اُس نے آنکھیں کھولیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور وادی بہشت عجیب وغریب قسم کی چیخ وپکار سے لرز رہی تھی۔ وہ مایوسی کے عالم میں سوچنے لگا کہ یہ طوفانی ہوائیں اور کڑکتی بجلیاں نہ جانے کب تک اس بہشت کے خوش رنگ پھولوں کی رنگت سیاہ کرتے رہیں گے۔ کہیں کہیں سے بجلیوں کے کڑکنے کی آوازیں آرہی تھیں اور طوفان کی رفتار کم ہورہی تھی۔ آسمان کا زیادہ تر حصہ صاف ہورہا تھا۔ آسمان پر چند ہی ستارے چمک رہے تھے باقی سب ٹوٹ چکے تھے۔ آسمان ان فنا شدہ ستاروں کے غم میں خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ اُسے تھکن سی محسوس ہونے لگی اور اُس پر نیند کا غلبہ بھی طاری ہونے لگا۔ وہ غنودگی کی حالت میں چھت سے نیچے اُتر کر اپنی خواب گاہ میں داخل ہوگیا اور بستر پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ جونہی اُس کی آنکھ لگ گئی تو آدھی صدی سے چلا آرہا ڈراونا خواب پھر سے اُس کی نیند میں خلل انداز ہوگیا اور خونین جھیل میں تیرتی ہوئی خوبصورت لاشوں کے خوفناک منظر نے جب اُس کی نیند کو توڑا تو اُسے محسوس ہونے لگا کہ وادی بہشت خونبار آنکھوں سے پکار رہی ہے......

آزادی......آزادی......!!!

ناقوس واذان

اسکول جاتے ہوئے ماسٹر گاش لال کی نظر غنی چاچا پر پڑی۔ غنی چاچا اپنے چھوٹے بیٹے احمد کو سمجھا رہا تھا کہ بڑی ہوشیاری سے بھیڑوں کی رکھوالی کرنا، کہیں کسی کے کھیت کا نقصان نہ ہونے پائے اور شام کے وقت انہیں گِن کر گھر واپس لانا۔ ماسٹر گاش لال یہ سُن کر غنی چاچا کو اپنے ساتھ نزدیکی اسکول لے گیا اور غنی چاچا کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا:

''غنی چاچا......! یہ اسکول سرکار نے آپ کے بچوں کے لئے کھولا ہے تا کہ آپ کے بچے تعلیم کے نور سے آراستہ ہو جائیں۔ آپ کا چھوٹا بیٹا احمد بھی کل تک اسکول آتا تھا اور آج آپ نے اُسے بھیڑ بکریوں کی رکھوالی پر مامور کیا۔''

''ماسٹر جی'' غنی چاچا ادب کے ساتھ بول پڑا'' مجھے بھی احمد کو پڑھانے کا شوق ہے لیکن ماسٹر اکرم صاحب نے مجھ سے کہا کہ احمد ذرا کُند ذہن ہے، اُس کو سبق یاد نہیں رہتا ہے: بہتر یہی ہے کہ آپ اُسے کسی کام دھندے میں لگا دو۔''

''احمد کُند ذہن نہیں ہے'' گاش لال احمد کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگا'' وہ بڑا ذہن بچہ ہے۔ اُسے کل دوبارہ اسکول بھیجنا۔''

''نہیں، ماسٹر جی'' غنی چاچا کرسی سے اُٹھتے ہوئے بول پڑا۔ ''احمد اب بھیڑ بکریوں کی رکھوالی ہی کرے گا۔'' ''نیچے بیٹھو'' گاش لال تُند لہجے میں بول پڑا۔ ''آپ مسلمان ہیں اور میں ایک پنڈت ہوں۔ آپ کا قرآن شریف ''اقراء'' کی تعلیم دیتا ہے یعنی پڑھو اور آپ مسلمان ہونے کے باوجود قرآن شریف کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔''

''لیکن ماسٹر اکرم......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں'' گاش لال نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''کل احمد کو پھر سے اسکول بھیجنا۔''

غنی چاچا کھیت کی طرف چلا گیا۔ ہل جوتتے ہوئے اُس کے ذہن میں بار بار ماسٹر گاش لال کی ''اقراء'' والی بات آتی رہی، وہ واپس گھر آیا اور احمد کا اسکولی بیگ ہاتھ میں اُٹھا کر بھیڑوں کے ریوڑ کی طرف چلا گیا اور احمد کو ساتھ لے کر اُسی دن اسکول پہنچ گیا۔ ماسٹر گاش لال یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ احمد بھی خوشی کے ساتھ کلاس میں چلا گیا۔

''میرے پاس اس وقت فیس نہیں ہے۔'' غنی چاچا ماسٹر گاش لال سے کہنے لگا۔ ''لیکن چند دنوں کے اندر اندر میں ضرور فیس بھیج دونگا۔''

''فکر کرنے کی کوئی بات نہیں'' گاش لال ایڈمیشن رجسٹر پر احمد کو درج کرتے ہوئے بولا۔''

''میں اپنی جیب سے اُس کی فیس ادا کر دوں گا لیکن تمہیں اُس کو ہمیشہ وقت پر اسکول بھیجنا ہوگا۔''

غنی چاچا، ماسٹر گاش لال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چل پڑا۔
یہ ایک خوشحال بستی تھی، جس کی تواریخ صدیوں کے آپسی بھائی چارے اور انسانی قدروں کے پاسدار اُصولوں پر مبنی تھی۔ بستی کے بیچوں بیچ، وقت کے سرد و گرم ہواؤں سے بے نیاز ایک سبک رفتار کشادہ ندی قرنوں سے اپنی گود میں برفیلے پانی کے میٹھے خزانے سمائے ہوئے رواں دواں تھی۔ ندی کے ایک طرف کثیر تعداد میں مسلمان آباد تھے اور دوسری جانب پنڈتوں کی قدرے قلیل آبادی موجود تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت ان پڑھ تھی اور زیادہ تر اپنے کھیت کھلیانوں میں ہی کھیتی باڑی کا کام کرتے رہتے تھے۔ پنڈت برادری زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھی۔ ان میں اکثر سرکاری ملازم تھے۔ ندی کے صاف و شفاف پانی کی تاثیر نے بستی کی فطرت میں شیر و شکر والی مٹھاس گھول دی تھی۔ پیار و محبت دونوں فرقوں کی مشترکہ میراث تھی اور ایک دوسرے کے غم و خوشی میں یہ لوگ بلا تفریق مذہب و ملت پیش پیش ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی مسجد سے جب صبح کی اذان فضا میں گونجتی تھی تو مندر سے بھی ناقوس کی صدا بلند ہوتی تھی۔ پرندے دونوں آوازوں کو سن کر پیڑوں پر خوشی سے چہچہانا شروع کر دیتے تھے۔ ندی کے تیز رو پانی سے مسلمان صبح کی نماز کے لئے وضو بناتے تھے اور ہندو بھی پوجا پاٹ کے لئے اشنان کرتے تھے۔ دونوں فرقوں کی عورتیں صفائی پکائی کے لئے مٹکوں میں پانی بھر بھر کر ہنستے مسکراتے ایک دوسرے کا حال چال پوچھتی رہتی تھی۔ ماسٹر گاش لال اور غنی چاچا اس بستی کے پشتنی باشندے تھے۔ بستی میں اگر کبھی

کبھار کوئی ناخوشگوار واقع پیش آجاتا تو یہ دونوں پہل کر کے صورتحال کو سنبھالنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکال لیتے دونوں کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ بستی کا کوئی بھی پیچیدہ مسئلہ دوراندیشی سے حل کر دیتے تھے۔

بستی کے لوگ روایتی انداز میں سوچنے کے قائل تھے۔ خورونوش کا سارا انحصار کھیت کھلیانوں پر تھا اس لئے وہ بڑی سادگی کے ساتھ اپنے بچوں کو پڑھنے پڑھانے کے برعکس کھیتی باڑی کے کاموں کی ترغیب دیتے تھے۔ گاش لال ایک سینئر ماسٹر تھا۔ وہ ہمیشہ وقت پر اسکول جایا کرتا تھا اور چھٹی کے بعد بستی والوں کو وقتاً فوقتاً تعلیم کی اہمیت سمجھاتے ہوئے انہیں اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ایک دن ماسٹر گاش لال نصف دن کی رخصت کے بعد اسکول کی طرف جارہا تھا۔ اُس نے راستے میں احمد کو اسکولی بیگ لئے روتے بلکتے ہوئے دیکھا۔ نزدیک پہنچ کر وہ احمد سے پوچھنے لگا کہ وہ اسکول چھوڑ کر کہاں جارہا ہے۔ احمد ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا کہ ماسٹر اکرم صاحب نے اُسے بہت پیٹا اور اسکول سے نکال دیا۔ گاش لال اُسے بازو پکڑ کر واپس اسکول لے آیا۔ اسکول پہنچ کر وہ ماسٹر اکرم کی کلاس میں چلا گیا اور احمد کو کلاس میں بٹھاتے ہوئے اکرم صاحب سے پوچھ بیٹھا:

"آپ نے احمد کو کیوں کلاس سے نکال دیا؟"

"اس کے پاس کبھی بھی کاپی نہیں ہوتی ہے۔" ماسٹر اکرم نے ناگواری سے جواب دیا۔

''اُس کے باپ کو بتا دینگے'' وہ کاپی لے آئے گا۔گاش لال نے نرم لہجے میں کہا۔''اس بات پر بچے کی پٹائی کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ میری کلاس ہے'' ماسٹر اکرم تیز لہجے میں بول پڑا'' اور اس میں کسی کو داخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔''مداخلت کی بات نہیں ہے۔یہ فرض کا معاملہ ہے اور اس کے لئے ہم تنخواہ لیتے ہیں ہم تعصب سے کام لے کر کسی کو تعلیم کے نور سے محروم کیوں کریں۔ پڑھانا ہمارا پیشہ ہے۔ تعلیم کا پیشہ پیغمبروں کا پیشہ ہے،اس کے ساتھ انصاف کرو۔''

''اچھا'' اب مجھے ایک پنڈت سے دین سیکھنا پڑیگا'' ماسٹر اکرم آپے سے باہر ہو گیا۔

''اپنے آپ کو بڑا مسلمان سمجھتا ہے'' ماسٹر گاش لال کو بھی غصہ چڑھ گیا''تم ان معصوموں کو ان پڑھ رکھنا چاہتے ہوتا کہ ان کی زندگیاں صرف دوسروں کا بوجھ اُٹھانے تک ہی محدود رہیں، تمہارے کام سے شیطان بھی شرمائے۔'' کافی تو تکار کے بعد ماسٹر گاش لال نے جیب سے پیسے نکال کر یہ کہتے ہوئے احمد کو دے دیئے کہ کل کاپی ساتھ لے آنا تمہیں اسکول سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احمد بھی پڑھائی میں آگے بڑھتا رہا۔ ماسٹر گاش لال نہ صرف احمد بلکہ اپنے دوسرے شاگردوں کی بھی بڑی شفقت سے رہنمائی کرتا۔آگے چل کر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود تمام شاگردوں کے دلوں میں اپنے شفیق استاد کا احترام موجود تھا۔احمد پڑھ

لکھ کر اُستاد بن گیا اور اپنے شاگردوں پر اپنے شفیق استاد کی طرح ہی شفقت بکھیرنے میں بخل نہیں کرتا رہا۔

وقت کا مزاج اچانک بدل گیا۔ بستی کے مثالی بھائی چارے پر بدامنی کے منحوس بادل چھا گئے ۔ خوف ودہشت کی تند ہوائیں گھر گھر میں پھیل گئیں۔ اندھے بندوق کا رعب چار سو چھا گیا۔ بھائی بھائی سے خوف کھانے لگا۔ پنڈت برادری کے دلوں پر خوف کا اثر کچھ زیادہ ہی پڑ گیا۔ خوف کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سیاسی سوداگروں نے انہیں اپنے گھروں سے بے گھر ہونے پر اُکسایا اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی چھپ چھپائے جموں کے اور بھاگنے پر مجبور ہو گئے ۔ ماسٹر گاش لال کے لڑکے روس میں سروس کرتے تھے۔ وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود کسی بھی ایجنسی کے جھانسے میں نہیں آیا۔ مسلم برادری نے یہ کہتے ہوئے اُس کی ہمت بندھائی کہ وہ اس آفت کا مل جل کر مقابلہ کرینگے اس لئے وہ بستی کے مثالی چارے کو توڑ کر یہاں سے جموں نہ چلا جائے۔ گاش لال کو اپنی جنم بھومی سے محبت تھی، اپنے کشمیر سے پیار تھا، یہاں کا مثالی بھائی چارہ اُس کی روح کا حصہ بنا ہوا تھا۔ مسلم برادری کے خلوص ومحبت نے اُس کے دل کو مطمئن کر دیا اور اس نے بیوی کے ساتھ اپنے اصلی گھر میں ہی قیام کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ غنی چاچا نے اپنے بیٹے احمد کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتے ہوئے گاش لال کے ہاتھ میں تھما دیا کہ آج سے وہ احمد کو اپنا بیٹا سمجھ لے۔ احمد نے اپنے استاد کی خبر گیری کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔

پندرہ برس گزر گئے۔ بستی کے حالات ابھی بھی کشیدہ تھے لیکن ماسٹر

گاش لال کو کبھی بھی اپنے فیصلے پر پچھتاوا نہ ہوا۔ بستی کے لوگ اُس کے دُکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہے۔ ایک مرتبہ بستی کے لوگ نئ مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے لیکن مناسب جگہ نہ ملنے کے باعث کچھ رکاوٹ پیش آرہی تھی۔ باتوں باتوں میں یہ خبر ماسٹر گاش لال تک پہنچی۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہی وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کے ذہن میں بستی کے گزرے ہوئے بھائی چارے کی حسین یادیں تازہ ہوگئیں۔ اسے اپنے بیٹے جواہر لال کی شادی کا وہ دن یاد آ گیا۔ جب مسلم برادری اپنے اپنے گھروں سے بھیڑ بکریاں، مرغ اور چاول لائے تھے۔ مہمانوں کی بھر پور خاطر داری کی تھی اور مسلمان عورتوں نے پنڈت عورتوں کے سُر سے سُر ملا کر لکشمی دلہن کا دل سے سواگت کیا تھا۔ صبح ہوتے ہی ماسٹر گاش لال نے تمام مسلم برادری کو اپنے گھر بُلا لیا۔ تمام لوگ جمع ہوگئے۔ ماحول پر ایک گھمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سبھی سوچ رہے تھے کہ ماسٹر جی کو یہ اجلاس بُلانے کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی؟ کہیں کوئی معاملہ تو نہیں ہوا ہے اور بستی کو خبر نہیں۔ گاش لال نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا:

''نئ مسجد شریف بنانے کا پروگرام کہاں تک پہنچا۔''

''زمین کم ہے، ابھی فیصلہ نہیں ہو پایا۔'' غنی چاچا نے کہا۔

گاش لال نے تکئے کے پیچھے سے کاغذات کا ایک پلندہ نکال کر برادری کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' غنی چاچا نے پوچھا۔

''میری زمین کے کاغذات'' گاش لال نے جواب دیا''میں چاہتا ہوں کہ میرے گاؤں کی مسجد میری زمین پر بنے۔''

گاش لال نے اپنی زمین کے کاغذات یہ کہتے ہوئے مسجد کمیٹی کے چیرمین کے حوالے کردے کہ میں بلا معاوضہ اپنی زمین مسجد شریف بنوانے کے لئے آپ لوگوں کو دیتا ہوں۔ مسلم برادری کو برسوں کا پُرانا مثالی بھائی چارہ یاد آ گیا اور تمام لوگ آنسو بہانے لگے۔

چند برس اور بیت گئے۔ سرما کا موسم تھا۔ ماسٹر گاش لال سخت بیمار پڑ گیا۔ بستی کے لوگ رات دن اُس کی خبر گیری کرتے رہے۔ علاج معالجہ ہوتا رہا لیکن گاش لال کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ اُسے جب یقین ہو گیا کہ زندگی کا آخری وقت آ گیا تو اُس نے احمد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یہ کہتے ہوئے آخری سانس لے لی کہ وہ اس کی چتا کو بڑے لڑکے کی طرح آگ لگائے گا۔ تمام لوگ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سڑکوں پر چار پانچ فٹ برف جمی ہوئی تھی۔ راستہ بند ہونے کی وجہ سے ماسٹر گاش لال کے رشتہ دار جموں سے کشمیر نہ آ سکے۔ مسلم برادری نے ہندو رسم کے مطابق گاش لال کی لاش کو نہلا دُھلا کر کفن پہنایا۔ ماسٹر گاش لال کے دوسرے شاگردوں نے اپنے شفیق اُستاد کی ارتھی کو کاندھوں پر اُٹھا کر شمشان گھاٹ پہنچا دیا اور احمد گنگا جل مٹکی اُٹھائے آگے آگے چلتا رہا۔ ماسٹر گاش لال کے ایک شاگرد نے ناقوس بجایا اور احمد نے چتا کو آگ لگا کر بڑے بیٹے کا حق ادا کیا۔ بستی کی فضا پر سوگ کا ماحول چھایا رہا۔ چند روز کے اندر اندر مسلم برادری نے شمشان

گھاٹ میں ماسٹر گاش لال کی سمادھی بناڈالی۔سمادھی کو پھولوں سے سجایا گیا اوراس کے اوپر سنگ مرمر کاایک پتھر رکھا گیا جس پر لکھا تھا:

''ناقوس واذان کا حقیقی پرستار......''
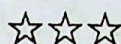
جنازے

وہ ایک آفت زدہ بستی تھی۔ وہاں طلوع آفتاب سے لیکر غروب آفتاب تک جنازے اُٹھتے رہتے تھے۔اس بستی میں موت کا رقص کئی برسوں سے جاری تھا۔کبھی بچے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اپنے بزرگوں کی لاش پر مٹی ڈالتے اور کبھی بزرگ اپنے ناتواں کندھوں پر اپنے جوان بچوں کا جنازہ اُٹھاتے رہتے۔ ہر ایک اپنی مستعار زندگی کا فکر مند تھا۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ کب، کہاں اور کیسے موت کی آغوش میں چلا جائے گا۔ ہر گلی سنسان اور ہر کوچہ ویران دکھائی دیتا، صرف قبرستان آباد ہو رہے تھے۔ وحشی گِدھ ہر وقت بستی کے اوپر منڈلاتے رہتے تھے۔ ہر گھر سے خوف و ہراس کی گھنٹیاں بجتی رہتی تھیں، ہر ذی حس سوچنے سے قاصر تھا کہ کس طرح ان وحشی خونخوار گِدھوں کے عذاب سے نجات مل سکتی ہے؟ اور کب اس بستی کے چمنستانوں کو خوشحالی کی خوشبودار ہوائیں نئی رونق سے نوازیں گی؟ کب ہمیں اس ظالم گھٹن سے آزادی ملے گی؟ بستی کا ہر فرد زندہ لاش نظر آتا تھا اور ذہنی تناؤ اور ہارٹ اٹیک کا ماحول اس بستی کے انسانوں کا مقدر بن چکا تھا۔ان کے دلوں سے صرف بدنصیبی کی آہیں نکلتی رہتی تھیں اور ان کی آنکھیں رو رو کے پتھر ہو چکی تھیں۔ٹوٹتے دلوں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

بچے جب اپنے بزرگوں سے اس سانحہ کی تاریخ کے بارے میں پوچھتے تھے اور ان کی بستی میں ان وحشی گِدھوں کی آمد کا سوال کرتے تھے تو افتادزدہ بستی کے غم زدہ بزرگ یہ سوچ کر بچوں کے سوال کو ٹال دیتے تھے کہ اگر انہوں نے انہیں ان مردہ خور گدھوں کی اصلیت سے آگاہ کیا تو نہ جانے اس نسل کا کیا حشر ہوگا جن سے ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں۔ لیکن بستی کی ویرانی نئ نسل کے ذہنوں کو روز بروز کوستی رہتی اور جوں جوں ان کی سوچ بڑھنے لگی اُن کو خود بخود اس ویرانی کا سبب معلوم ہونے لگا۔ وہ اپنے گلستانوں میں ویرانی کے بدلے خوشحالی لانے کے لئے تڑپنے لگے۔ اُن کی تڑپ بغاوت میں بدل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بستی کی یہ نئ نسل خوشحالی لانے کی تاریخ کا حصّہ بننے لگی۔

موسم بدلتے رہے۔ سوچیں بدلنے لگیں۔ ہر موسم اپنے ساتھ نئے نئے گِدھ ساتھ لاتا گیا لیکن خوشحالی کی متمنی اس نسل کا جوش اور اُبلنے لگا۔ ان کی زبان پر صرف ایک لفظ تھا خوشحالی...... خوشحالی......! بستی کے بزرگ ابھی اپنے نوجوان نسل کی خون ٹپکتی لاشوں کو بھول نہیں پائے تھے کہ نئ نسل نے بھی وہی راہ اختیار کرلی۔ یہ نسل بڑی ہوشمندی کے ساتھ خوشحالی کے لئے جدوجہد کرنے لگی۔ وہ اپنے اسکول بھول گئی۔ اپنی خوشیاں چھوڑ بیٹھی۔ وہ پڑھنے کے بدلے اپنے مقصد سے پیار کرنے لگی اور ان کا مقصد تھا ان وحشی گِدھوں کو اپنے خوبصورت گلستان سے نکال دینا۔ انہوں نے خوشی کے کھلونوں کے بدلے غم کے پتھر ہاتھوں میں اُٹھائے اور ان اجنبی وحشی

گِدھوں کونشانہ بناتے گئے۔ پتھروں نے وحشی گِدھوں میں ہلچل مچادی۔ ان کونئ نسل کا مقصد سمجھ میں آ گیا۔ ان کو یہ نا گوار گزرا کہ وہ ان شاہین صفت بچوں کے گلستان پر ایک عرصہ سے راج کرتے آئے ہیں اور اب یہ ہمیں یہاں سے بھگانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ ایسا ہم ہونے نہیں دینگے۔ ان وحشی گدھوں نے ان شاہین صفت بچوں پر جھپٹنا شروع کردیا اور اپنے خونخوار نوکیلی چونچوں سے ان کے دل و دماغ کو نوچنے لگے۔ نئ نسل بغیر ہمت ہارے جان کی بازی لگا کران وحشیوں پر پتھروں سے وار کرتے گئے۔ بستی کی مٹی سرخ ہوتی گئی۔ گلی گلی سے خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ خونخوار گِدھ بستی کے ہر فرد کو اپنے زہریلے پنجوں سے چیر پھاڑ کرر کھ دیتے۔

ہر گھر سے ماتم کی صدائیں آرہی تھیں۔ بہار بھی خزاں کی یاددلا رہی تھی۔ بزرگ نا چاہتے ہوئے بھی اپنی نئ نسل کو گھروں میں قید کر کے رکھتے تھے۔ لیکن عارضی خاموشی جلد ہی ٹوٹ جاتی اور نئ نسل موقع ملتے ہی وحشی گِدھوں پر ٹوٹ پڑتی۔ ہر طرف موت کی چیخیں سنائی دیتیں۔ پلٹ جھپٹ کا یہ سلسلہ چلتا رہا، بڑھتا رہا۔ بستی والوں کی پرنم آنکھیں آسمان کے چمکتے ستاروں کے فیصلے کی منتظر تھیں لیکن آسمان کے چمکتے ستارے اپنے مقصد اور مفاد کے مطابق اپنے فیصلے بدلتے رہتے۔ ہر ستارہ نئ نئ سازش کا جال بنتا گیا۔ بستی کے گلستان قبرستان میں تبدیل ہوتے گئے۔ اور گلشن کے پھولوں میں خون کی سرخی نمودار ہوتی گئی۔ نوجوان نسل کی خوبصورت لاشوں کو مٹی کے حوالے کرتے ہوئے بزرگوں کے ہاتھ کپکپاتے تھے۔ خوف وہراس کی

بدنصیب ہواؤں سے ان کے کمزور جسم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بستی کے سبھی لوگ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے اپنے اپنے جنازے میں گم تھے۔

مشنِ القدس

ہوش میں آتے ہی اُس نے اپنی نظریں چہار جانب گھمائیں۔ اپنے اردگرد ہتھیار بند افراد دیکھ کر وہ گھبرا سا گیا۔ وہ بیڈ سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اُٹھ نہ سکا۔ وہ اپنے اردگرد انجانے چہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔

انجانے چہروں کے حُلیے نے اس پر وحشت طاری کر دی۔ اُس کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک آدمی اُس کے سامنے دودھ کا گلاس رکھ چلا گیا اور چند منٹوں کے بعد ایک اور آدمی کے ساتھ واپس آیا. یہ ہمارے امیر صاحب یعنی کمانڈر رہے۔ کمانڈر کا بارعب چہرہ دیکھتے ہی اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ کمانڈر اُس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اور دودھ کا گلاس ہاتھ میں اُٹھا کر اُسے پلانے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر اُسے تھوڑا سا اطمینان تو ہوا لیکن دل اندر ہی اندر سے ڈوبتا جا رہا تھا۔

"آپ کا نام ڈیوڈ ہیں۔" کمانڈر نے مسکراتے ہوئے پوچھا" اور آپ ہمارے ملک میں ایک خفیہ مشن پر مامور ہو۔"

کمانڈر کی غیر متوقع معلومات جان کر وہ حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں" کمانڈر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے بول پڑا۔ ''آپ اس وقت ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کے ساتھ اچھا سلوک روا رکھنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔''

کمانڈر کی تسلی بخش باتیں سُن کر اُسے یک گونہ اطمینان ہوا اور اُس نے کمانڈر کی طرف ہاتھ بڑھا کر شکریہ ادا کیا۔ کمانڈر بیڈ سے اُٹھ کر نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ تمام لوگ اکٹھا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ نماز ادا کرنے کے بعد کمانڈر مجاہدین سے خطاب کرنے لگا۔

''ہم مجاہدین ہیں...... ہمارا مقصد دنیا میں امن و امان قائم کرنا ہے۔ ظالموں کو سزا دے کر مظلوموں کو انصاف دلانا ہے. ہم مقدس جہاد کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں کوئی بھی بے گناہ انسان قتل نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں صرف ان لوگوں کے ساتھ لڑنا ہے جو ہمارے خلاف سازشیں رچا رہے ہیں اور جو ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ ہمیں کسی مذہب کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ دنیا کے تمام لوگ آزادی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکیں، چاہئے ان کا کوئی بھی ملک ہو یا وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔''

کمانڈر کا خطاب سُن کر ڈیوڈ کا سر چکرانے لگا۔ حقیقت نے اس کے شبہات کو صاف کر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ میں اس وقت ان لوگوں کا دشمن ہوں اور انہوں نے مجھے میری تکلیف میں ہر طرح کا خیال رکھا۔ میری اصلیت جاننے کے باوجود بھی یہ لوگ میرے ساتھ انسانیت سے پیش آرہے ہیں۔ یہ تو انسانیت کے سپاہی نظر آرہے ہیں پھر ہم انہیں دہشت گرد کی گالی کیوں

دیتے ہیں۔

ڈیوڈ ایک سخت گیر یہودی تھا۔ وہ اُس ملک میں ''مشنِ القدس'' کے ایک خفیہ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ ایک دن اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور وہ بُری طرح زخمی ہوکر بے ہوش ہوگیا۔ مجاہدین اُسے زخمی حالت میں اُٹھا کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ آپریشن کرانے کے دوران انہیں شناختی کارڈ سے پتہ چلا کہ وہ مشن القدس کا ایک خفیہ ایجنٹ ہے جو اس مُلک میں مجاہدین کا دوست نُما دشمن بن کر سازش کرانے کے لئے آیا ہوا ہے۔ چند مہینے مجاہدین کی نگرانی میں رہ کر وہ جب صحت یاب ہوا تو اُسے اپنے ملک واپس چلے جانے کا حکم ملا۔ وہ اپنے ملک واپس تو لوٹا لیکن اب مجاہدین کے اچھے برتاؤ اور انسانیت پرستانہ مقاصد نے اُسے ایک نئی سوچ عطا کی تھی۔ اُسے اپنے مشن پر ندامت ہورہی تھی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی انسانیت کا سپاہی بن جائے۔ ایک دن اُسے جب اپنے کمانڈر کی مسیج مل گئی تو اُس نے ''مشن القدس'' کا وِڈیو آن کیا۔

''یہ گیم کھیلنے سے ہمیں کیا فائدہ ملے گا، سر'' جوزی نے دھیمی آواز میں کمانڈر سے سوال کیا۔

''آپ ہماری عالمگیر ایجنسی کی ایک نئی ممبر ہو، جوزی'' کمانڈر اسے سمجھاتے ہوئے بولا ''جونیر ہونے کی وجہ سے آپ کا تجربہ بھی ابھی کم ہے اس لئے اپنے مائنڈ کو صرف سننے کی حد تک ہی محدود رکھو۔''

''ایکس کوزمی سر......! جوزی کا سوال بڑا اہم ہے۔'' ڈیوڈ نے بڑے

مہذبانہ انداز سے پوچھا۔ ''جس مشن کا منصوبہ آپ بنا رہے ہیں یہ کوئی آسان مشن نہیں لگ رہا ہے۔''

''یوآر رائٹ مسٹر ڈیوڈ۔'' کمانڈر نے اسٹک سے ڈیوڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس مشن کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ دو تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرنے کا مشن ہے۔''

''لیکن اسے تہذیبی تصادم کی ایک نئی جنگ کا آغاز ہوگا۔'' ہین ٹیکسن کرسی سے اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ''مسٹر ہین ٹیکسن'' کمانڈر خوش ہو کر اُسے مخاطب ہوا ''میں آپ کی سوچ کی داد دیتا ہوں، اس لئے آپ کو بڑی ذمہ داری کا کام سونپ رہا ہوں۔''

''تھینک یو سر'' ہین ٹیکسن نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''پر وہ کونسا اہم کام ہے سر۔''

''مسٹر ہین ٹیکسن'' ''آپ ہمارے خفیہ گروپ کے ایک باشعور سینئر ممبر ہو۔'' کمانڈر میٹنگ ہال میں چہل قدمی کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولنے لگا۔ ''آپ دونسلوں کی نفسیات کا فائدہ اُٹھا کر ایک ایسی مشکوک کتاب لکھیں گے جو دنیا کے انٹلیکچول مائنڈز کو بہت جلد اپنی مسیج سے متاثر کریگی۔''

''تو مجھے اس نفسیاتی بم Psychological bomb کو لوجیکل کیمسٹری Logical Chemistry کی تکنیک Technique سے

تیار کرنا ہوگا۔'' ہین ٹیکسن کمانڈر کی تجویز سُن کر بول پڑا۔

''یس، یس ...... میرے پلان ماسٹر'' کمانڈر جوشیلے انداز میں ہین ٹیکسن کو شاباشی دیتے ہوئے بولا۔

''اوکے سر'' ڈیوڈ استفہامیہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''پلیز ہمیں اس مشن کے وجوہات اور مقاصد سے آگاہ کریں۔''

''ڈیئر فرنڈس'' کمانڈر اپنی صدارتی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خطاب کرنے لگا۔

''اس مشن کا مقصد ہماری نسل کی سُپر میسی اور خود اعتمادی کو بحال کرنا ہے۔ اپنی مقدس سرزمین کو غیروں سے پاک کرانا ہے۔ ہم اعلیٰ نسل کے وارث ہیں لیکن اعلیٰ نسل ہونے کے باوجود ہمیں دوسری کم تر نسلوں کے رحم وکرم پر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ یہ تہذیبیں ہماری تہذیب کے بعد وجود میں آئیں لیکن اپنے پاور کے بل بوتے پر انہوں نے ہمیں خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں اب اپنا مستقل ٹھکانہ چاہیئے، یہ تبھی ممکن ہے جب ہم ان دونسلوں کو اپنے خفیہ سازشی نیٹ ورک کے کنڑول میں لائینگے۔''

''بہت خوب سر'' جوزی بے تابی کے ساتھ بول پڑی ''مشن کا مقصد تو سمجھ میں آگیا۔ اب مشن کے چلانے کے بارے میں بھی ہمیں بتایئے''۔

''ویل جوزی'' کمانڈر نے پلان کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے کہا۔

''مشن کے مطابق ان دونسلوں کے الگ الگ نام رہیں گے،

سفید کرگس اور شاہین صفت کبوتر۔ جوزی ...... تمہارے گروپ کے اوپر یہ
ذمہ داری رہے گی کہ وہ سفید کرگسوں کے پاور کو شاہین صفت کبوتر مزاج نسل
کے خلاف استعمال کرنے کا راستہ ہموار کرینگے اور ڈیوڈ کے گروپ کا کام
شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کے جذبات کا فائدہ اُٹھا کر انہیں سفید کرگسوں
کی بالادستی کے خلاف استعمال کرنے کا ہے۔ اس خفیہ مشن کا نام رہے گا۔
"مشنِ القُدس"

مشنِ القدس نے اپنا سازشی منصوبہ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے
شروع کیا۔ چند ہی برسوں کے اندر اندر انہوں نے دونوں نسلوں کی نفسیات
کو اپنے کنٹرول میں کرلیا۔ دونوں نسلیں نفسیاتی جنگ کی شکار ہوگئیں۔ ڈیوڈ
کے گروپ نے شاہین صفت کبوتر مزاج نسل کے جذباتی سوچ کو استعمال
میں لایا اور سفید کرگسوں کے ہمالیہ نما مضبوط ٹھکانوں کو آگ کے شعلوں میں
تبدیل کروایا۔

دوسری جانب جوزی گروپ نے سفید کرگسوں کی بالادست نفسیات
کو بھڑکایا اور انہیں شاہینوں سے بدلا لینے پر اُکسایا۔ سفید کرگسوں نے
شاہینوں کے چمنستانوں پر قیامت برپا کردی۔ لاکھوں شاہینوں کے گرم گرم
خون سے سارے چمنستان لال ہوتے چلے گئے۔ ہر ذہن پر خوف کے
سائے منڈلانے لگے۔

مشن القدس چلانے والے چند برسوں تک اپنی کامیابی کے خواب
دیکھتے رہے لیکن دھیرے دھیرے انہیں اپنے خواب سراب ہوتے دکھائی

دینے لگے۔

دنیا کے یہ خونین مناظر ڈیوڈ کے ضمیر پر کوڑے برسانے لگے۔ وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اس حیوانی کھیل کا ذمہ دار ٹھہراتا رہا۔ آخر کار اُس نے مشن القدس سے بغاوت کر کے انسانیت کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ وہ عالمی ایوانوں تک انسانیت کی آواز پہنچانے کا عزم کر کے اُٹھا اور دنیا میں امن و آشتی پھیلانے کی زوردار مہم شروع کی، لیکن اندھیرا بہت بڑھ چکا تھا اور سفید کرگسوں نے ساری فضا میں ادھم مچا رکھی تھی۔ مشن القدس نے شاہینوں کی بلند پروازی پر مثبت اثر ڈالا۔ ان میں بکھراؤ کے بدلے اتحاد کی فضا پھیل گئی۔ ان کی اڑانوں سے دنیا کا چپہ چپہ لرزنے لگا۔ ان کی زوردار پروازوں سے مشن القدس کے سازشی ذہن نفسیاتی دباؤ کے شکار ہو گئے اور سفید کرگس بچاؤ کے راستے تلاش کرنے لگے۔ مشن امن کا چرچا ہر طرف ہو رہا تھا اور جدید دنیا کی ایک نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔

مینٹل ہاسپٹل

آوارہ کتوں کی ہڑبونگ نے بستی میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ یہ کتے کسی بھی گلی، کسی بھی راستے پر بلاخوف انسانوں پر حملہ کر دیتے۔ دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی آدمی ان کی کاٹ سے ضرور زخمی ہو جاتا تھا۔ بچوں کی نفسیات آوارہ کتوں کے خوف سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو رہی تھی. یہ خوف یونہی نہیں تھا، چونکہ پچھلے کئی برسوں سے درجنوں بچے ان کتوں کے کاٹنے سے مر گئے تھے۔ لوگ میونسپلٹی والوں کو کئی بار اس مصیبت سے آگاہ کرتے رہے۔ وہ بھی میونسپلٹی کی گاڑی لے کر آجاتے اور ہاتھ لگے آٹھ دس کتوں کو لے جا کر کسی ویرانے میں ڈال جاتے۔ پھر چند روز کے بعد پکڑے گئے کتے دوبارہ بستی میں نمودار ہوتے اور اس انداز سے بستی کا دورہ کر جاتے جیسے کہ کہنہ مشق چور کو پولیس والوں نے چوری کے الزام سے باعزت رہا کیا ہو۔ برف پڑنے کے ساتھ ہی پتہ نہیں اس بے زبان مخلوق کی فطرت پر سردی کا کون ساز ہریلا اثر پڑ جاتا اور اکثر کتے پاگل ہو جاتے۔ پاگل ہوتے ہی وہ بلا تفریق بچے بوڑھوں کو کاٹنا شروع کر دیتے۔ بستی کے لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے اُٹھا کر ان پر حملہ کر دیتے اور وہ بے زبان چیوں چوں کرتے کرتے جان دے دیتے۔ کئی مرتبہ بستی کے لوگوں نے میونسپلٹی اہلکاروں سے گزارش

کی کہ ان آوارہ کتوں کو مارنے کی کوئی سبیل نکالیں لیکن میونسپلٹی اہلکار انکار کرتے ہوئے کہتے رہتے کہ قانونِ حیوانات کے مطابق کوئی بھی انسان کُتے کو مار نہیں سکتا ہے اور اگر کوئی یہ غلطی کر ڈالے گا تو اُسے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔ بستی کے لوگ جدید قانون کے اس انوکھے فیصلے کو سُن کر ششدر رہ جاتے کہ انسان آوارہ کتے کو مارے گا تو جیل اور نہ مارے گا تو خود اُس کی کاٹ سے مارا جائیگا۔ لوگ پریشان تھے کہ کریں تو کیا کریں ......! بستی میں ایک دانا بزرگ رہتا تھا جو قدیم اور جدید علوم سے بھی آگاہ تھا ۔اُس کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کا ہر شخص قائل تھا۔ وہ بستی کے مشکل سے مشکل مسئلوں کو اپنی ذہانت کے بل پر آسانی کے ساتھ حل کر دیتا تھا۔ لوگ مجبوراً اس تشویشناک مسئلے کو لے کر اُس کے پاس چلے گئے۔ اُس نے تمام روداد سُن کر لوگوں کے سامنے ایک ایسی تجویز رکھی جس کو سُن کر لوگ فوراً مان گئے۔ لوگوں نے بستی سے باہر گھنے جنگل میں ایک بہت بڑی سرائے بنا ڈالی ۔ یہ سرائے بنانے میں لوگوں کو کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی، چونکہ جنگل میں لکڑی وافر مقدار میں موجود تھی اسلئے چند ہی دنوں میں لکڑی کی ایک لمبی چوڑی سرائے تیار ہوئی۔ سرائے کا ایک حصّہ پاگل ہونے والے کتوں کے لئے رکھا گیا۔ تمام کتوں کو ہانک ہانکا کر نئی جگہ کی طرف دھکیلا گیا۔ سرائے کے نزدیک ایک ندی بہتی تھی۔ بستی کے لوگوں نے ندی کے ساتھ ساتھ سرائے کے اردگرد ایک بڑی دیوار بھی کھڑی کر دی تا کہ کتے پھر سے بستی کی طرف نہ آسکیں۔ میونسپلٹی کے اہلکار بھی یہ سُن کر خوش ہوگئے کیونکہ اُن کی

پریشانی دور کرنے کا مناسب حل نکل آیا تھا۔ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈیپارٹمنٹ سے کتوں کے کھانے پینے کا انتظام کروایا۔ یہ اطلاع جب تحفظ حیوانات کے یورپین این ، جی اوز کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے حیوان دوستی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے سرائے کے پاس ہی ایک اسپتال بنوایا اور اپنے سوشل ورکر قابل رحم ڈاکٹرس کو وہاں پر تعینات کیا تا کہ وہ ان بے زبانوں کی دیکھ ریکھ کرتے ہوئے ان کے علاج معالجے کا بھی خیال رکھ سکیں۔ بستی کے لوگوں نے بھی راحت کی سانس لی۔ اب نہ کسی آدمی کو کتوں کی کاٹ سے کٹنے کا ڈر تھا اور نہ رات کے وقت نیند میں خلل اندازی کا کوئی اندیشہ تھا کیونکہ نہ کہیں کتا نظر آتا تھا اور نہ کہیں رات کے سایوں میں کسی کتے کے بھونکنے کی بے سُر آواز سنائی دیتی تھی۔

زندگی کا کارواں سُبک رفتاری سے چلتا رہا۔ این ، جی اوز کی کوئی نہ کوئی ٹیم کسی نہ کسی دن گاڑی میں سوار ہو کر بستی سے گزرتی ہوئی سرائے کی طرف چلی جاتی۔ اسپتال کا تعیناتی عملہ چھوٹے چھوٹے پلّوں کو دن بھر نہلاتا دھلاتا اور انہیں قسم قسم کے بسکٹس کھلاتا رہتا۔ بستی کے جو لوگ جنگل میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ ہوتے تھے، وہ ان انگریزوں کی حیوان دوستی پر پہلے پہلے حیران پڑ جاتے لیکن آہستہ آہستہ اس حیرانی نے متاثر ہونے کا اثر شروع کردیا۔ وہ جب شام کے وقت کسی جگہ اکٹھا ہو جاتے تو غیر شعوری طور پر دوسرے لوگوں کو بھی انگریزوں کے طور طریقوں سے آگاہ کرتے رہتے۔ اب اگر بستی کا کوئی فرد بیمار ہو جاتا تو این جی اوز کے اہلکار اُس کا مفت علاج

کراتے رہتے۔ لوگوں کو ان کے یہ کام پسند آنے لگے۔ لوگوں کی پسند کو دیکھ کر این۔جی۔اوز نے پہلے بستی کے اندر ایک چھوٹا موٹا اسپتال کھولا جہاں پر مفت علاج کی سہولت دستیاب رکھی گئی۔ اس کے بعد لوگوں کی رضامندی سے ایک انگریزی اسکول بھی کھولا گیا۔ دھیرے دھیرے بستی کے اندر انگریزی اسکول کا چرچا ہونے لگا۔ بستی کے تعلیم یافتہ افراد نے جب اس نئے اسکول میں اپنے بچوں کو فخر کے ساتھ ایڈمیشن کروایا تو بستی کے ان پڑھ افراد بھی اپنے بچوں کو جدید تعلیم دلوانے کے لئے اسکول کی طرف رجوع کرنے لگے۔ این۔جی۔اوز نے بستی کے اقتصادی طور پسماندہ بچوں کے لئے مفت تعلیم دینے کا اعلان کروایا۔ اب بستی کے بیشتر بچے انگریزی اسکول میں تعلیم پانے لگے۔ بستی کے دانا بزرگ نے کئی مرتبہ بستی کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے بچوں کو ضرور جدید تعلیم دینے کی کوشش کرو لیکن ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم سے بھی روشناس کراؤ اور اس انگریزی اسکول کے بدلے اپنا ایک اچھا اسکول کھولو جہاں پر جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہئے تا کہ ہماری نئی نسل پڑھ لکھ کر انسانی خصائل سے بھی آراستہ ہو۔

وقت کی تیز رفتاری انسانی سوچ کو تیز رفتار بنا دیتی ہے۔ تیز رفتار تیز رفتار گھوڑے کو جب اچانک ٹھوکر لگتی ہے تو وہ ایسے زمین پر دھڑام سے گر جاتا ہے کہ پھر وہ منزل کی طرف آہستہ آہستہ چلنے کے قابل بھی نہیں رہتا ہے۔ بستی کے دانا بزرگ کی حکمت آمیز باتوں کی طرف لوگوں نے کوئی

دھیان نہیں دیا۔ کوئی انہیں فرسودہ خیالات کہہ کے رد کرتا رہا اور کوئی انہیں جدید زمانے کی تیز رفتار ترقی میں رُکاوٹ کا مشورہ سمجھ بیٹھتا۔ دانا بزرگ نہ قدیم خیالات کی وکالت کر رہا تھا نہ جدید تعلیم سے بیزار تھا' وہ صرف انسانی قدروں کی پاسداری چاہتا تھا تا کہ انسان، انسان کی طرح زندگی گزار سکے۔ وہ خود انگریزی دنیا کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ وہ ان کے ڈسپلن، فکر و تدبر، تعلیم و تربیت اور ترقی کے طور طریقوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتا تھا اور اپنے لوگوں میں یہ خصائل دیکھنے کا خواہشمند تھا لیکن اُسے اگر نفرت تھی تو انگریزوں کی مصنوعی سوچ سے، مادیت پرستی اور ان کی مکارانہ فکر سے۔ اُس کے ذہن میں حکیم الاّمت علامہ اقبالؔ کا انگریزوں کی فطرت پر فرمایا ہوا یہ پُر حکمت مصرع ہمیشہ رہتا تھا۔

''پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات''

بستی کے لوگ انگریزی اسکول کی صاف ستھرائی، ڈسپلن، تعلیم اور بول چال سے متاثر ہوتے رہے۔ یہ چیزیں یقیناً قابل ستائش تھیں کیونکہ انسان کو صاف ستھرائی، ڈسپلن اور تعلیم کے نور سے ضرور آراستہ ہونا چاہیئے۔ بستی کے اکثر بچے انگریزی اسکول میں تعلیم پاتے رہے۔ امتحانات میں اچھی کارکردگی دکھاتے رہے۔ سمیناروں میں حصّہ لے کر بڑے بولڈ بنتے گئے۔ ہائر ایجوکیشن کے لئے انہیں مغربی ممالک بھیجا گیا۔ وہ بڑی بڑی ڈگریاں لے کر واپس آتے گئے۔ بستی کے قدیم ماحول میں جدید ہوائیں چلنے لگیں۔ بستی کے بیشتر گھرانوں میں جدید سہولیات کی تمام چیزیں پہنچ

گئیں۔ گھر گھر میں ڈش ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائیل کی دُھنیں بجنے لگیں۔ صبح کے وقت اخلاقیات کی کتابوں کے بجائے انٹرنیٹ اور ڈش ٹی وی کے فحاش مناظر کی طرف ذہن راغب ہوتے گئے۔ اب اسپتالوں میں خراب گردے کے ساتھ ساتھ اچھے گردے بھی غائب ہونے لگے۔ دفتروں میں انسانوں کے نوکیلے دانتوں سے لوگ زخمی ہونے لگے۔ رات کے وقت گلی کوچوں میں نشہ آور حیوان شکار کی تاک میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھومنے لگے۔ باحیاء عورتوں کا گھر سے نکلنا دوبھر ہوگیا۔ نئی نسل کے ذہنوں پر صرف مادیت کا بھوت سوار تھا۔ دنیوی زندگی کو حتمی زندگی سمجھنے کا تصور پھیل چکا تھا اور آخرت کی زندگی کو دیوانے کا خواب کہہ کر رد کیا جا رہا تھا۔ انسانی رشتوں کا تصور ختم ہونے لگا۔ نیکی اور بدی کے درمیان کوئی فرق نہ رہا۔ عبادت گاہوں کی طرف چند بزرگ کمر جُھکائے ہوئے جاتے نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف آپا دھاپی کا عالم تھا۔

نئی نسل کی طوفانی زندگی کے زہریلے تھپیڑوں سے بزرگوں کے دل دہلنے لگے۔ نئی نسل کی دین بیزاری، بے راہ روی، خودغرضی اور سانپوں والی فطرت سے خوف زدہ ہو کر بستی کے بزرگوں نے جب احتجاج کرنا چاہا تو انہیں یہ سُن کر اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا کہ انہوں نے آنکھیں بند کر کے جن بچوں کو مغربیت کی سونامی میں پھینکا تھا وہ آج طوفان بن کر انہیں اپنے ہی گھروں سے بے گھر کر کے برسوں پرانی بنائی ہوئی کتوں کی سرائے کو اولڈ ایج ہوم (Old Age Home) بنانے کا اعزاز دے کر بے یار و مددگار

بھیجنا چاہتے ہیں۔

بستی کے لوگ بظاہر خوشحال دکھائی دے رہے تھے لیکن ان کے دل اندر ہی اندر ٹوٹ چکے تھے۔سماج میں مادی چیزوں کی فراوانی کے باوجود روحانی سکون کا جنازہ نکل چکا تھا۔ بزرگ اس طوفان سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ بہت ساری ترکیبیں جب ناکام ثابت ہوئیں تو وہ بالآخر لاچار ہوکر بڑی شرمندگی کے ساتھ بستی کے دانا بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوگئے ۔بزرگ نماز پڑھنے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہوا۔ان لوگوں کی دردناک داستان سُنتے ہی وہ آنکھیں بند کرکے برسوں پہلے کے اُس دہشت ناک حادثہ میں کھو گیا جب بستی کے اندر آوارہ کتوں نے ہڑبونگ مچا رکھی تھی اور کسی بھی راہ چلتے انسان کو اپنے نوکیلے دانتوں سے کاٹ کھاتے تھے۔

تمام لوگ دانا بزرگ کے حکمت بھرے خیالات سننے کے لئے بے تاب ہورہے تھے۔لوگوں کے چہرے پر خوف کی ہوائیں اُڑ رہی تھیں۔ بزرگ نے آنکھیں کھولتے ہوئے ان لوگوں کے سامنے ایک حکمت بھری تجویز رکھی اور انہیں اس تجویز پر جلد عمل کرنے کی تلقین کرتے ہوئے رخصت کردیا۔

لوگوں کے ذہنوں میں انتشار کے بجائے سکون نے جگہ پائی اور ان کے دلوں میں وسواس کے بجائے یقین کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ صبح ہوتے ہی لوگ کالے لباس میں سفید جھنڈے اُٹھاتے ہوئے انگریزی اسکول کی طرف طوفان بن کر دوڑ پڑے۔ این۔جی۔اوز کے تمام اہلکار

راتوں رات بھاگ گئے تھے۔ اسکول کے اوپر سبز جھنڈا چڑھایا گیا۔ انگریزی تہذیب کی پروردہ نسل خوف زدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگی۔ انہیں مشرقی تہذیب کی دلدادہ نسل نے رسیوں سے باندھ کر سرائے کی طرف گھسیٹا، پھاٹک کھولتے ہی بند سرائے کے کتے بستی کی جانب دوڑ پڑے۔ سرائے کے اوپر ایک بہت بڑا بورڈ لٹکایا گیا جس پر جلی حروف سے لکھا ہوا تھا...... مینٹل ہاسپٹل۔
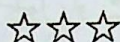
دوشالہ

خوجہ کاک کی اُمیدوں پر جیسے اُوس پڑی ہوئی تھی۔ ریشم خانہ چلانے کے لئے ایک تجربہ کار کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی ڈھنگ کا کاریگر نہ ملنا خوجہ کاک کے لئے سوہان روح ثابت ہو رہا تھا۔ اُس کی حسرت بھری آنکھیں کارخانے کی بے کار مشینوں کو تکتے تکتے پتھرا سی گئی تھیں۔ چار کمروں والا معمولی سا مکان تک گروی رکھ کر اُس نے بنک سے جو قرضہ لیا تھا، سال بھر بیت جانے کے باوجود بھی وہ بنک کے قرضہ کا ایک فیصد بھی ادا نہ کر پایا تھا۔ دوسرے مل مالکوں کی کامیابی کے مقابلے میں اپنی تجارت کی ناکامی نے اُس کے ذہن میں ایک ایسا تناؤ پیدا کیا تھا کہ وہ اکثر بیوی بچوں کے ساتھ فضول میں لڑتا جھگڑتا اور کبھی کبھی خودکشی کرنے کے بُرے خیالات بھی اُس کی سوچ کو گھیر لیتے۔ جو بھی بیوپاری ایک مرتبہ اُس کے کارخانے سے مال خرید لیتا تو نفع کے برعکس نقصان اُٹھانے کی وجہ سے وہ دوبارہ اُس کے کارخانے کا منہ تک دیکھنا گوارا نہ کرتا۔ کافی عرصہ بیت جانے کے بعد جب ایک دن بنک کے کرمچاری پولیس لے کر خوجہ کاک کے گھر میں نمودار ہوئے اور اُسے بیوی بچوں سمیت گھر سے بے دخل کرنے لگے تو یہ خبر سنتے ہی بستی کے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ کافی منت سماجت کرنے کے بعد بستی کا

ایک غریب ہمدرد شخص ریشم چاچا بنک کرمچاریوں سے چند مہینے کی مہلت دینے پر راضی کر گیا۔ آفت تو ٹل گئی لیکن خوجہ کاک گھر کی دہلیز پر غمگین صورت بنائے سر جھکا کر اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ ریشم چاچا اُس کی ہمت باندھی اور اُسے ہاتھ پکڑ کر کارخانے کی جانب لے گیا۔ ریشم چاچا کارخانے کا بغور مشاہدہ کر کے بول پڑا۔

''خوجہ کاکہ! آپ نے فضول میں پریشانی کو گلے لگایا ہے خدا پر بھروسہ رکھو وہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔''

''بھروسہ تو خدا پر ہی ہے'' خوجہ کاک سرد آہ بھرتے ہوئے کہنے لگا ''لیکن کارخانے کی ناکامی نے مجھے کہیں کا نہ رکھ چھوڑا۔''

''کوئی بات نہیں'' ریشم چاچا اُس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا ''اگر خدا نے چاہا تو تیرا کارخانہ دن دُگنی رات چُوگنی ترقی کرے گا۔''

''لیکن وہ کیسے'' خوجہ کاک ریشم چاچا کا منہ تکتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

''تم صرف ایک کام کرو'' ریشم چاچا اُسے دلاسہ دیتے ہوئے بول پڑا۔ ''کل کارخانے کی صفائی ستھرائی کرانا اور دس دنوں تک ریشم منگوالینا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن......!''

''میں تیری بات سمجھتا ہوں۔'' ریشم چاچا نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کارخانہ میں چلاؤں گا۔''

یہ غیر متوقع خوشخبری سنتے ہی خوجہ کاک کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی

اور اُس نے یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو گلے لگایا کہ تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول پاؤنگا۔"

ریشم چاچا ریشمی دوشالے بننے کا ایک تجربہ کار کاریگر تھا۔ یہ ریشمی دوشالے بنانے میں اتنا ماہر تھا کہ لوگ اُسے اُس کے اصلی نام کے بجائے ریشم چاچا کے نام سے ہی یاد کیا کرتے تھے۔ خوجہ کاک نے اگرچہ کئی مرتبہ ریشم چاچا سے کہا بھی تھا کہ وہ اگر اُس کے کارخانے میں کام کرے گا تو وہ اُسے دُگنی تنخواہ دے گا لیکن ریشم چاچا یہ کہہ کر ہمیشہ انکار کرتا رہتا کہ وہ اپنے مالک کے ساتھ چند پیسوں کے بدلے دھوکہ نہیں کرسکتا۔ برسوں سے وہ جس آدمی کا کارخانہ سنبھالتا آیا ہے وہ اُس کا بھروسہ نہیں توڑ سکتا۔

ریشم کے دوشالے بنانے میں ریشم چاچا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ یہ اُس کا خاندانی پیشہ تھا۔ جن لوگوں کے ہاں بھی اُس نے کام کیا تھا۔ ان کے گھروں میں ریشم چاچا کی کاریگری سے چاندی ہی چاندی دکھائی دے رہی تھی، لیکن ریشم چاچا کی قسمت میں دوسرے سینکڑوں کاریگروں کی طرح دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔ ریشم چاچا جس بستی میں رہتا تھا وہاں کے سب لوگ ریشم کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ اسی مناسب سے اُس بستی کا نام ریشم آباد پڑا تھا۔ بستی صرف ریشم آباد نام کی تھی اصل میں وہاں غریبی اور ناداری کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ لوگ مہد سے لے کر لحد تک بڑے لوگوں کے کارخانوں میں اپنا خون پسینا بہاتے رہتے اور اس کا معاوضہ بس اتنا ملتا کہ گھر کا چولہا ٹھنڈا ہونے سے بچ جاتا۔ دوسری جانب فیکٹریوں کے مالک ان

لوگوں کی محنت کے بل پر عیش وعشرت کی زندگی گزارتے رہتے۔

چند دنوں کے بعد ریشم چاچا نے خوجہ کاک کے کارخانے کا کام سنبھال لیا۔ اُس کے کام سنبھالتے ہی خوجہ کاک کی قسمت چمک اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مال اتنا بکنے لگا کہ جو لوگ کل تک خوجہ کاک کے مِل کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہی اب مال کے لئے ایڈوانس بکنگ کروانے لگے۔ خوجہ کاک کے گھر میں دولت کی ریل پیل اتنی بڑھ گئی کہ بنک کا سارا قرضہ سود سمیت ادا کرنے کے علاوہ وہ ایک بڑی جائیداد کا بھی مالک بن گیا۔ لوگ بڑی حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اُس کی دولت وحشمت کا تذکرہ کرتے رہے۔ خوجہ کاک ایک شاندار گاڑی میں مِل کی طرف جاتا تھا اور ریشم چاچا کے ساتھ دن بھر کے تجارتی معاملات پر صلح مشورہ کرتا رہتا۔ ایک دن اُس نے ریشم چاچا کو دو عدد ریشمی شال بنانے کے لئے کہا۔ شال بنانے کے بعد جب ریشم چاچا نے اُس کی خدمت میں پیش کئے تو خوجہ کاک نے ایک شال ریشم چاچا کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ تم اپنی بیٹی کے لئے رکھنا، شادی کے دن کام آئیگا۔ ریشم چاچا حیرانی اور خوشی کے ملے جُلے تاثرات کے ساتھ کہنے لگا۔

''خوجہ صاحب! یہ قیمتی شال ہے میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

''آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔'' خواجہ کاک اپنائیت کے لہجے میں کہنے لگا۔ ''آپ کی بیٹی مجھے اپنی بیٹی جیسی ہے اور کارخانے کے اصل مالک تو آپ ہیں۔''

بہر حال ریشم چاچا آگے کچھ نہ بول سکا اور وہ شال لیکر گھر چلا گیا۔ کئی برسوں تک کارخانے میں کام کرتے کرتے ریشم چاچا کے آنکھوں کی بینائی میں فرق آنے لگا تھا۔ ایک دن جب وہ کپڑے بننے کی مشین چلا رہا تھا تو اچانک اُس کا ہاتھ مشین کی زد میں آکر کٹ گیا۔ کئی مہینوں تک اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے باوجود بھی وہ ٹھیک نہ ہو سکا۔ روز بروز جب وہ کمزور ہوتا چلا گیا تو ایک دن ڈاکٹروں نے اُس کی بچی سے کہا کہ وہ پچاس ہزار روپے کا انتظام فوری طور پر کرے تا کہ ریشم چاچا کا آپریشن ہو سکے۔ بیٹی کو پریشان دیکھ کر ریشم چاچا نے اُسے خوجہ کاک کے پاس بھیجا۔

''بیٹی کیسے آنا ہوا؟'' خوجہ کاک نے پوچھا۔

''خوجہ کاکہ''! ریشم چاچا کی بیٹی آنسو بہاتے بہاتے بول پڑی۔ ''بابا کا آپریشن کروانا ہے اس کے لئے پچاس ہزار روپے درکار ہے۔''

''پچاس ہزار'' خوجہ کاک حیرانی کے ساتھ بول پڑا۔ ''دیکھو بیٹی! یہ تو بڑی رقم ہے۔ اوپر سے اپنی بچی کی شادی کے دن بھی قریب آرہے ہیں۔ جس پر بہت سے پیسے صرف ہو رہے ہیں۔''

''خوجہ کاکہ'' ریشم چاچا کی بیٹی منت سماجت کرنے لگی۔ ''آپ کے بغیر ہم کس کے پاس جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اگر جلدی آپریشن نہ ہوا تو بابا کی جان کو خطرہ ہے۔''

''اس وقت پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکتا ہے۔'' خوجہ کاک نے تند خُوئی سے جواب دیا ''البتہ بچی کی شادی کے بعد دیکھا جائے گا۔''

ریشم چاچا کی بیٹی ٹوٹے قدموں وہاں سے واپس لوٹی۔ اسپتال پہنچ کر وہ بابا کے بیڈ کے پاس بیٹھ گئی۔ ریشم چاچا کے پوچھنے پر جب اُس نے خوجہ کاک کی دل توڑنے والی بات بتائی تو ریشم چاچا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ''بیٹی! ہماری قسمت میں ریشم کی گانٹھ پڑی ہے۔''

ڈاکٹروں نے چک اَپ کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے ریشم چاچا کو اسپتال سے رخصت کر دیا کہ جب پیسوں کا انتظام ہو جائے گا تو اُسے دوبارہ ایڈمٹ کرانا۔ ریشم چاچا کے جسم میں انفکشن زہر کی طرح پھیلتا گیا اور چند دنوں تک اس زہر نے پھیلتے پھیلتے اُس کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالا۔

خوجہ کاک کے گھر میں شادی کی تقریب بڑی دھوم دھام سے چل رہی تھی۔ سینکڑوں مہمان دعوت کا مزا اُڑا رہے تھے۔ دولہے کے استقبال کے لئے صحن میں قالین بچھائے جا رہے تھے۔ ریشم چاچا کی بیٹی بدحواسی کے عالم میں وہاں پہنچ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے قیمتی شال کو سینے سے لگائے رکھا تھا۔ آنسوؤں کی دھار سے قیمتی شال تر بتر ہو رہا تھا۔ اُسے خوجہ کاک کے محل نما مکان کے چمکتے رنگ و روغن میں اپنے باپ کے خون کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔ خوجہ کاک اپنی بیٹی کو جہیز میں دینے والی دس لاکھ کی گاڑی کا سنگار کرانے میں مگن تھا۔ ریشم چاچا کی بیٹی رقت آمیز لہجے کے ساتھ خوجہ کاک کی گود میں ریشمی دوشال ڈالتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگنے لگی۔

''اے امیر خوجہ کاک! مجھے اس ریشمی شال کے بدلے اپنے غریب بابا کے لئے کفن چاہئے۔'' ☆☆☆

وطن کی عصمت

وہ دونوں رات بھر ان وحشی درندوں کی درندگی کا شکار ہوتی رہیں۔ وطن کے محافظ ہی راہزنی کا کھیل کھیلتے رہے۔ وہ ان درندوں سے ہاتھ جوڑ کر...... گڑگڑا کر رہائی کی فریاد کرتی رہیں، ان سنگ دل جلادوں سے رحم کی بھیک مانگتی رہیں کہ "خدا کے لئے ہم پر رحم کھاؤ، ہمیں چھوڑ دو...... وحشی مت بنو...... تم وطن کے رکھوالے ہو، وطن کی عصمت پر ڈاکہ مت ڈالو" لیکن ان معصوم کلیوں کی آہ وزاری سے کسی بھی درندے کا دل نہیں پگھلا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ درندے آزاد قسم کے وحشی تھے۔ اُن کی رگوں میں انسانی خون کے بدلے ہوس کی شراب دوڑ رہی تھی۔ ان دو معصوم کلیوں کو ڈیڑھ درجن درندے شب بھر مسلتے رہے اور اپنے آہنی پنجوں سے ان کے جسموں کو نوچتے رہے۔ صبح کے وقت جب مسجدوں سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں تو ان دونوں کی سانسیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دی گئیں۔

ان دونوں کلیوں کا سانحہ، محکوم بستی کی مظلوم تاریخ کے درد بھرے اوراق کا ایک اور قابل رحم حصّہ بن گیا۔ آسیہ اور نیلوفر گاؤں سے دور اپنے باغیچے میں کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی باغیچے میں ہی تھیں کہ دن کا اُجالا رات کی کالی چادر اوڑھے جا رہا تھا۔ وہ دونوں گھر کی طرف نکل

پڑیں۔ جونہی انہوں نے سامنے کی ندی پار کی تو سڑک پر انہوں نے ایک گاڑی دیکھی۔ چند ہی لمحوں کے اندر انہیں وردی پوش درندوں نے اپنے قابو میں لے لیا اور اپنے جرموں کے محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا. وہ ٹھکانے جو سلامتی کے محفوظ ٹھکانے ہوا کرتے ہیں. دونوں کو ایک کمرے میں بند کیا گیا. یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر وہ دونوں سہم گئیں. آسیہ کالج کی طالبہ تھی اور نیلوفر اُس کی بھابی دو برس کے بچے کی ماں۔ دونوں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔ نیلوفر کا دل پارہ پارہ ہو رہا تھا جب وہ سوچتی تھی کہ اس کے جگر کا ٹکڑا دُودھ کے لئے تڑپ رہا ہوگا اور وہ مما مما چلاتا ہوگا۔ ایک گھنٹے کے بعد دو درندے جب کمرے میں داخل ہو گئے تو وہ دہشت کے مارے ہاتھ جوڑ کر ان کے پاؤں پڑیں اور آنسو بہاتے بہاتے ان سے اپنی رہائی کے لئے منت سماجت کرنے لگیں لیکن وہ درندے ان معصوم کلیوں پر حیوانوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ یہ سلسلہ شب بھر چلتا رہا۔ یکے بعد دیگرے درندے اس وحشیانہ اور شیطانی فعل کا حصہ بنتے رہے۔ ان دونوں کا جسم اندر سے کٹ رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھیں لیکن وحشی درندوں کی پیاس نہیں بجھتی تھی۔ وہ بے ہوش ہوتی گئیں اور رات بھر ظلم کا شکار ہوتی رہیں۔ یہ رات اُن کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی۔

ظالم کتنا بھی ظلم کو چھپانے کی کوشش کرے بہر حال ظلم کی چیخ ضرور سنائی دیتی ہے۔ آسیہ اور نیلوفر کے قتل کی چیخ تمام وادی میں پھیل گئی اور ساری وادی سراپا احتجاج بن گئی۔ چمن کے مالی نے اسے ایک حادثہ قرار دیا

لیکن جب احتجاج کی آگ پھیلتی گئی تو اُس طفل دبستان مالی نے اپنے بیان سے توبہ کرلی اور لوگوں سے معافی مانگتے وقت اسے ایک سانحہ کے طور پر قبول کرنے پر مجبور ہوگیا۔ لوگوں کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لئے ایک انکوائری کمیشن تشکیل دیا گیا جس نے بیالیس دنوں کے بعد اپنی رپورٹ میں اس سانحہ کی جان ہی نکال دی۔ مجرموں کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنے کے بجائے قتل کی گئی دونوں لڑکیوں کے کردار کو داغدار بنانے اور انصاف کے طالب ان کے گھر والوں کو اس قتل کے ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی گئی۔

آسیہ اور نیلوفر کی مظلوم روحیں انصاف کا انتظار کررہی ہیں اور اُن کی چیختی عصمتیں رات کے بھیانک سائے پھیلتے ہی چلا چلا کر وادی کے ہر انسان سے فریاد کررہی ہیں۔ ان کی غیرت کو للکار رہی ہیں کہ اٹھو ان قاتلوں سے ہمارا بدلہ لو...... کب تک تم اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹوں کی عصمتوں کو تار تار ہوتے ہوئے دیکھو گے...... اُٹھو، اپنی آواز اُٹھاؤ...... ان ظالموں کے خلاف...... ان جابروں کے خلاف اور اپنے وطن کی عصمت...... اپنی وادی کی عصمت کو بچاؤ۔

آئے زندگی نہ گزرنا ہماری گلیوں سے
ابھی ہمارے جنازے گھروں میں رکھے ہیں
(نسرین نقاش)

☆☆☆

رحمت کے پھول

رئیس خان کے گھر سے جب چیخ وپکار کی آواز اُٹھی تو پاس پڑوس کے لوگ اس کے گھر کی جانب دوڑ پڑے۔ سلیم خان اپنی بیوی کو بڑی بے رحمی سے پیٹ رہا تھا۔ دو معصوم بچیاں ماں کے ساتھ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ رئیس خان نے سلیم خان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا اور اُسے دھکے مار مار کر کمرے سے باہر کر دیا۔ ایسے واقعات اس گھر میں کبھی نہ کبھی رونما ہوتے رہتے تھے اور اس تعلق سے افراد خانہ کے درمیان کبھی کھبار تلخ کلامی بھی ہو جاتی تھی۔ گھر کا امن وسکون افراد خانہ کے آپسی پیار ومحبت سے ہی قائم رہ سکتا ہے اور جب سوچ میں بگاڑ آجائے تو نہ صرف امن وسکون کے خوشحال محل میں ویرانی چھا جاتی ہے بلکہ گھر کی عزت بھی تماشا بن جاتی ہے۔

سلیم خان اور شکیلہ کی شادی کے سات برس مکمل ہو رہے تھے۔ سلیم خان نے گریجویشن کے بعد تجارت کا پیشہ اپنایا تھا اور مقامی مارکیٹ میں اپنا ایک کلاتھ شاپ کھولا تھا۔ پہلے پہل اُسے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ہمت نہیں ہار بیٹھا۔ چند برسوں کے اندر اندر اس کی محنت رنگ لائی اور دکان کا کام اتنا بڑھ گیا کہ اُسے پل بھر بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ شکیلہ کے آنے سے ان کے گھر کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔ وہ اگر چہ میٹرک

پاس ہی تھی لیکن گھر گرہستی سنبھالنے میں ایسی سلیقہ شعار کہ گھر کی خوشحالی میں چار چاند لگ گئے۔ وہ تمام گھر والوں کے ساتھ بڑے مہذبانہ انداز اور شگفتہ روی سے پیش آتی تھی۔ وہ جس اپنائیت اور خوش اسلوبی سے ساس سُسر کی خدمت کرتی تھی، وہ خویش واقارب میں مثال بن گیا تھا اور ساس سُسر اُسے بہو کی بجائے بیٹی کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ چند برس بڑے خوش و خرم سے گزر گئے۔ میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی کوئی بھی ناخوشگوار واقع پیش نہیں آیا۔ لیکن رفتہ رفتہ دونوں کی مٹھاس بھری زندگی میں کڑواہٹ آنے لگی۔ کڑواہٹ کا سبب ان کی دو معصوم لڑکیاں تھیں۔ شکیلہ کا پاؤں پھر سے بھاری تھا۔ گھر کے کام کاج میں اگرچہ اُس کی ساس اس کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھی لیکن شکیلہ کے ذہن پر ہمیشہ ایک انجانے خوف کا سایہ چھایا رہتا تھا اور وہ خوف تھا تیسری اولاد کا..! وہ سوچتی رہتی کہ اگر اس بار بھی لڑکی کا جنم ہوا تو کیا معلوم اُس کا خاوند اُس کے حق میں کیا فیصلہ سنا دے گا۔ وہ یہ بات تو خود سمجھتی تھی کہ لڑکی یا لڑکے کا جنم نہ اُس کے بس میں ہے اور نہ اُس کے خاوند کے بس میں، یہ پھل تو اوپر والے کے فیصلے کے مطابق دنیا میں آتے ہیں لیکن سلیم خان کے سر پر لڑکے کا بھوت ایسے سوار ہوا تھا کہ وہ معمولی بات پر بھی شکیلہ کو یہ کہتے ہوئے زدکوب کرنا شروع کر دیتا کہ ”تمہارے اندر لڑکا پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اس لئے تمہاری گود میں سے صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، تم میں ضرور کوئی کھوٹ ہے۔“

ایک رات جب سلیم خان دکان سے گھر لوٹا تو شکیلہ نے کھانا اس کے

سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ کل اُسے میکے چلے جانا ہے۔ ''تجھے کون جانے سے منع کر رہا ہے۔'' سلیم خان طنز کرتے ہوئے بولا ''جاو! اور ایک مصیبت ساتھ لے کر آنا''۔ ''مصیبت'' شکیلہ تُند لہجے میں بولی ''بیٹیوں کو مصیبت مت کہو۔ کس والدین کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا نام بیٹا روشن کریگا یا بیٹی...... ؟'' یہ سنتے ہی سلیم خان کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی اور اُس نے ڈنڈا اُٹھا کر شکیلہ کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شور وغل سن کر گھر کے دوسرے لوگ بھی ان کے کمرے میں آ گئے اور سلیم خان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا گیا۔ سلیم خان غصے کی وجہ سے اناپ شناپ بک رہا تھا اس کا والد رئیس خان جب کمرے کے اندر آیا تو بہو کے آنسو اُسے برداشت نہیں ہوئے۔ طیش میں آ کر وہ سلیم خان کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر کے سرزنش کرنے لگا۔

''جاہل انسان!...... لڑکیاں رحمت کے پھول ہوتی ہیں۔ اسلامی تعلیم کے مطابق لڑکیوں کی اچھی پرورش انسان کو جہنم سے بچا سکتی ہے۔ لڑکا یا لڑکی، دونوں خدا تعالیٰ کے عطا کردہ دو میٹھے پھل ہیں اور تم جیسے جاہل لوگ میٹھے پھلوں کے درمیان امتیاز کر کے اپنی نادانی کا ثبوت فراہم کرتے ہو۔''

باپ کی سرزنش سے سلیم خان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اُور وہ پشیمان ہو کر کمرے سے نکل گیا۔ دوسرے دن سلیم خان باپ کی ہدایت کے مطابق شکیلہ کو سسُرال چھوڑنے چلا گیا۔

شکیلہ ہمیشہ پریشان سی رہتی تھی۔ وہ سوچتی رہتی کہ اگر پھر سے لڑکی کا جنم ہوا تو پتہ نہیں سلیم خان کیا کر بیٹھے گا۔ اسی فکر نے اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔

لیکن شکیلہ کی پریشانی اس وقت خوشی میں بدل گئی جب اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔لڑکے کی خوشخبری سے دونوں گھرانے چہک اُٹھے ۔ چند مہینے بعد شکیلہ کی واپسی سے گھر کی خوشیاں دوچند ہوگئیں۔ سلیم خان نے اپنے بیٹے کا نام ظفر یعنی کامیابی رکھا۔ گھر میں اب شانتی ہی شانتی نظر آرہی تھی۔ سلیم خان ہر وقت خوشی سے جھومتا رہتا اور دکان سے گھر لوٹنے کے بعد بچوں سے ایسے گھل مل جاتا کہ شکیلہ اسے کبھی کبھی ازراہ مذاق چھیڑا بھی کرتی تھی کہ زیادہ لارڈ پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں اور سلیم خان بھی مسکرا کر کہتا رہتا ''تم میرے بچوں کے پیار میں دخل مت دیا کرو۔''

اسکول جانے کی عمر میں سلیم خان نے ظفر کا ایڈمیشن شہر کے ایک نامور اسکول میں کروایا۔ وقت گزرتا رہا۔لڑکیاں جی لگا کر پڑھتی رہیں لیکن ظفر پڑھائی کی طرف کم ہی دھیان دیتا رہا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا چال چلن بھی بدلتا گیا۔ سلیم خان نے اسے ہر قسم کی راحت میسر رکھی تھی۔ گھر میں کمپیوٹر اور گھومنے پھرنے کے لئے شاندار گاڑی ، لیکن اس سب کے باوجود وہ پڑھائی کے بجائے آوارہ گردی کرنے میں وقت گزارتا رہتا۔ کئی بار یار دوستوں نے سلیم خان کو ظفر کے بُرے عادات کے بارے میں بتایا بھی لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹالتا رہا کہ وقت آنے پر بچہ خود سنبھل جائے گا۔ شکیلہ بھی اُسے وقتاً فوقتاً ظفر کی آوارہ گردی کے متعلق کہتی رہی اور وہ یہ کہہ کر اُسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیتا کہ تم بیٹیوں کی طرف دھیان رکھو، ظفر تو لڑکا ہے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن بدلتے وقت کے ساتھ سلیم خان کو بھی ظفر کے بگڑتے چال چلن سے تشویش ہونے لگی۔ اس نے ظفر کو بہت بار سمجھایا بھی کہ وہ اپنے آپ کو سدھارے اور پڑھائی کی طرف دھیان دے لیکن ظفر تھا کہ اپنی مستی کے عالم میں مست۔ وہ نہ صرف اسکول میں غنڈہ گردی کرتا رہا بلکہ اب وہ لڑکیوں کو بھی چھیڑنے سے عار محسوس نہ کرتا تھا۔

سلیم خان کی بڑی لڑکی نے ایم اے کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی اور یونیورسٹی کی طرف سے اُسے گولڈ میڈل ملنے والا تھا۔ گھر کے تمام لوگ خوش تھے۔ سلیم خان نے ظفر کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''تم بھی محنت کرو اور پڑھ لکھ کر کچھ اچھا بن کے دکھاؤ۔''

''میں کیا پڑھتا نہیں ہوں'' ظفر نے غصے میں کہا۔

''پڑھتا تو تو بھی ہے میرے لال'' ماں نے اُسے بوسہ دیتے ہوئے کہا ''لیکن بہنوں کی طرح محنت کرو تا کہ تو بھی ہمارا نام روشن کر سکے۔''

تمام لوگ اس دن کا انتظار بڑی بے تابی سے کر رہے تھے اور ان کا انتظار اُس دن ختم ہو ہی گیا جب ان کی ذہین اور با کردار بیٹی گولڈ میڈل لے کر بڑی شان سے گھر میں داخل ہوگئی۔ سارا گھر خوشی سے جھوم اُٹھا اور سلیم خان کے گھر میں مبارک باد دینے والے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ سلیم خان اپنی بیٹی کی صلاحیتوں کے گُن گانے لگا اور شکریہ کے الفاظ زبان سے ادا کرتا گیا۔ گھر میں ابھی خوشی کی چھل پہل جاری تھی کہ شام کے وقت سلیم خان کے گھر پر اچانک پولیس نمودار ہوئی اور ظفر کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے

لگی۔ سلیم خان نے جب ظفر کو آواز دے کر بُلایا تو پولیس اُسے ایک لڑکی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لے گئی۔ غم کی کڑواہٹ نے خوشی کی مٹھاس کو چوس لیا۔ سارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ سلیم خان نے آنسو بہاتے ہوئے دونوں بیٹیوں کو گلے لگاتے ہوئے بڑے دردناک لہجے میں کہا ''آج میں زندگی کے بڑے فریب کو سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔''

گلہ قصائی

منحوس چہرے پر نظر پڑتے ہی گُلہ قصائی کے تن بدن میں آگ سی دہک اُٹھتی اور وہ سامنے پڑے لکڑی کے تختے پر موجود گوشت کے بڑے ٹکڑے کو تیز دھار چاقو سے بوٹی بوٹی کر ڈالتا۔ گُلہ قصائی کا یہ حیرت خیز عمل کئی مہینوں سے جاری تھا۔ اس کی دوکان کے سامنے چاہیے خریدار ہو یا نہ ہو پھر بھی منحوس چہرے کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھ خود بخود چاقو تھام لیتے اور اندھا دُھند گوشت کاٹنا شروع کر دیتے۔ نفرت انگیز غصے سے اُس کی آنکھیں لال پیلی ہو جاتیں اور گالوں پر سُرخی پھیل جاتی۔ کبھی کبھی کوئی خریدار گلہ قصائی کی بدلتی رہتی عجیب وغریب کیفیت سے تھوڑا سا حیران پڑ جاتا۔

گُلہ قصائی کی دوکان سرکاری اسپتال کے مین گیٹ پر تھی۔ جوانی سے لیکر اب اس ادھیڑ عمر میں بھی وہ بڑی سرعت سے اپنا کام کرتا رہتا۔ اُس کی خوش اخلاقی اور ایمانداری نے خریداروں کے دل جیت لے تھے۔ وہ ہر کسی کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتا رہتا لیکن ڈاکٹروں کی عزت کرنے میں وہ کچھ زیادہ ہی فراخ دل ثابت ہوا تھا۔ جب بھی کسی ڈاکٹر کی گاڑی گیٹ سے آتی جاتی تو اُس کا ہاتھ سلام کرنے کے لئے فوراً اٹھ جاتا اور جب بھی کوئی ڈاکٹر گوشت خریدنے آتا تو گُلہ قصائی گوشت تولنے کے بعد ایک

دو ٹکڑے لفافے مین زیادہ ڈال دیتا.ڈاکٹر لوگ جب گلہ قصائی کی دریا دلی کی تعریف کرتے تو وہ مسکرتے ہوئے کہہ اٹھتا کہ ڈاکٹر کا پیشہ مسیحائی کا پیشہ ہوتا ہے .آپ لوگ نہ صرف عوام کی خدمت کرتے رہتے ہیں بلکہ ان کے دُکھ درد کا علاج کر کے انھیں تکلیف سے بھی نجات دلواتے ہواور یہ کہتے ہوے وہ اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ انھیں ضرور سناتا کہ برسوں پہلے جب اس کی بیوی دردزہ کی حالت میں اسی اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی تھی تو ڈاکٹر مشتاق صاحب رات بھر اُس کے علاج معالجے میں کھڑے رہے اور صبح کے وقت اُسکا آپریشن کر کے ایک پھول سی بچی میری گود میں مسکراتے ہوئے ڈال دی تھی ۔ میں نے شکریہ کے ساتھ جب چند روپے انھیں دینے کی کوشش کی تھی تو اُس نے سخت ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں ۔ مجھے سرکار آپ لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے ہی تنخواہ دیتی ہے ۔ جاؤ، ان پیسوں سے بچی کے لئے کپڑے لاؤ۔

وقت بدلتا رہا اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی سوچ بھی بدلتی گئی ۔ انسانی دلوں میں انسانیت کے بدلے مادیت کا زہر پھوٹنے لگا۔ گُلہ قصائی کی بچی کا پاؤں بھاری تھا ۔ وہ دوپہر کے وقت دکان کے کام کاج میں لگا ہوا تھا ۔ اُس کا چھوٹا بیٹا دوڑتے دوڑتے دوکان پر آکر کہنے لگا کہ ماں نے کہا ہے کہ بہن کی طبیعت کچھ خراب سی ہوگی ہے اس لئے جلدی گھر آجاؤ ۔ گلہ قصائی دکان بند کر کے گھر کی جانب دوڑ پڑا اور بیٹی کو آٹو میں لاکر اسپتال میں ایڈمٹ کروایا۔

بیٹی دردزہ سے کراہ رہی تھیں لیکن گلہ قصائی ڈاکٹر کے علاج سے مطمئن تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر کے ساتھ اُس کی علیک سلیک تو ہے ہی اس لئے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹہ گزرنے کے بعد نرس نے گلہ قصائی کے ہاتھ میں ایک پرچی تھمادی۔ گلہ قصائی پرچی لیکر مارکیٹ میں دوائی کی دکان پر چلا گیا اور دوافروش سے دوائی دینے کو کہا۔ دوافروش گُلہ قصائی کا جان پہچان والا آدمی تھا۔ اُس نے پرچی دیکھ کر گلہ قصائی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ وہ دوسری کمپنی کا دوا لکھ کر دیں لیکن گلہ قصائی کو یہ بات سمجھ نہیں آئی اور وہ دوافروش سے جلدی جلدی دوا لیکر اسپتال کی جانب دوڑ پڑا۔ گلہ قصائی وارڈ سے باہر بڑی بے قراری کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ بیٹی کی کراہانے کی آوازیں اُس کے دل کو چھلنی کر رہی تھیں۔ اُس کی آبدیدہ نگاہیں بار بار اوپر کی جانب اٹھ رہی تھیں اور وہ سرد آہیں لیتے لیتے سرگوشی کے انداز میں خداتعالیٰ سے دُعا کر رہا تھا کہ وہ اُس کی بیٹی کو نظرِ رحمت سے نوازے۔ دن ڈھلتے ہی نرس نے گلہ قصائی سے کہا کی ڈاکٹر کی کوشش کے باوجود بھی آپ کی بیٹی کو کوئی راحت نہیں مل رہی ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب کی ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے۔ اُس کو کلنک پر جانا ہے۔ آپ کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا تو آپ کو اسی وقت شہر کے اسپتال جانا پڑے گا یا ڈاکٹر صاحب کے پرائیوٹ کلنک پر اسکا علاج ہو سکتا ہے۔ جلدی مشورہ کرو نہیں تو دیر ہو جائے گی اور آپ کی بیٹی کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ نرس کی باتیں سُن کر گُلہ قصائی پریشان ہو گیا۔ بیوی سے مشورہ کر کے بیٹی کو کلنک میں

ایڈمٹ کیا گیا۔ نرس نے دوائی کی ایک اور پرچی تھماتے ہوئے گلہ قصائی
سے کہا کہ اسکا میجر آپریشن کرنا پڑیگا۔ اس کے لئے تقریباً بیس ہزار کا انتظام
کرنا پڑے گا۔ بیس ہزار کا نام سنتے ہی گلہ قصائی سکتے میں آ گیا۔ وہ سوچنے
لگا کہ اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے ہوگا۔ چند ہزار تو میں نے اس دن کے لئے
سنبھال کر رکھے تھے ان میں زیادہ تر خرچ ہو گے۔ گُلہ قصائی نے جب یہ
بات بیوی کو بتائی تو اسکا سر بھی چکر کھانے لگا۔ میاں بیوی ابھی اس بارے
میں سوچ ہی رہے تھے کہ زندگی اور موت کی کشمکش میں جھول رہی بیٹی کے
ہاتھ میں سونے کا کنگن دیکھ کر باپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار نکل
پڑی۔ بیٹی کے ہاتھ سے سونے کا کنگن لیتے ہوئے گُلہ قصائی کو ایسا محسوس
ہونے لگا کہ جیسے آج اُس نے اپنے ہی گھر میں ڈاکہ ڈالا ہو۔ مارکیٹ بند
ہونے جا رہا تھا۔ گُلہ قصائی نے ایک دکان پر چڑھ کر سونار کے سامنے کنگن
رکھ دیا۔ سُنار نے کنگن کا وزن کر کے گُلہ قصائی سے کاروباری زبان میں کہا
کہ سونے کا بھاؤ گر گیا ہے اور پھر بھی یہ استعمال شدہ سونا ہے اس لئے
پندرہ ہزار سے زیادہ اس کی قیمت نہیں ہے۔ بر حال گُلہ قصائی کے اصرار پر
سُنار نے اُسے سولہ ہزار دے دئے اور گُلہ قصائی پیسے لیکر سیدھے کلنک کی
جانب بھاگتے ہوئے پہنچا۔ پیسے جمع کرنے کے بعد جب گُلہ قصائی ڈاکٹر کو
لیکر کمرے میں داخل ہوا تو اپنی بیٹی کی آخری آواز اُس کے کانوں سے
ٹکرائی۔۔۔۔ بابا۔۔۔! گُلہ قصائی کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہر طرف چیخنے
چلانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

گھر میں ماتم داری کے دن گزارنے کے بعد گلہ قصائی دل پر پتھر رکھ کر دوکان پر دوبارہ بیٹھ گیا۔ وہ اب سرکاری اسپتال کو ذبیح خانہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اُس کا ہاتھ نہ کسی ڈاکٹر کو سلام کرنے کے لئے اٹھتا تھا اور نہ ہی وہ کسی ڈاکٹر کو ڈاکٹر مشتاق کی داستان سناتا تھا۔ اُس منحوس چہرے کی گاڑی جب گیٹ سے اندر چلی جاتی تو گُلہ قصائی کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی اور وہ تیز دھار چاقو کو گوشت پر اندھادُھند چلانا شروع کر دیتا۔

عید قربان کا تہوار تھا۔ عرفہ کی گہما گہمی سے بازار چمک رہا تھا۔ گلہ قصائی کی دکان پر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ گلہ قصائی گوشت کٹائی میں مصروف تھا کہ ایک مانوس آواز نے اُسے چونکا دیا۔ منحوس چہرے کو دیکھتے ہی گُلہ قصائی کی آنکھیں لال پیلی ہوگی۔ اُس کے ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ ڈاکٹر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اُسے ایک کلو گوشت چاہیے وہ بھی بھیڑ کا ،کیونکہ اُس کی بیٹی کا پاؤں بھاری ہے۔ پیسے دیتے ہوئے اُس نے مزید کہا کہ وہ اسپتال سے چھٹی کے بعد گوشت لے گا۔

''بیٹی کا پاؤں بھاری ہے'' والی آواز بار بار گُلہ قصائی کے کانوں سے ٹکراتی رہی۔ اس آواز نے اُسکے اندر ایک خوش گوار احساس جگا دیا۔ دکان کے کام سے فراغت پا کر وہ دوافروش سے دوائی کی ایک شیشی لایا۔ شیشی کا ڈھکن کھول کر دوائی پانی میں ملا دی اور گوشت کو پانی میں بھگونے لگا۔ اُس کے ذہن میں عجیب وغریب قسم کے خیالات آتے رہے۔ وہ بڑی بے صبری سے ڈاکٹر کا انتظار کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر جونہی گوشت

لینے کے لئے آیا تو اُس نے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر کے ہاتھ میں گوشت بھر الفافہ تھمادیا۔ڈاکٹر پارک والی جگہ پر گاڑی کی طرف جانے لگا۔گلہ قصائی راحت کی سانس لیکر خیالات کے گہرے سمندر میں کھوگیا۔ڈاکٹر نے جب گاڑی اسٹارٹ کی تو گلہ قصائی کی آنکھوں کے سامنے عید کی خوشی کا منظر رقص کرنے لگا۔اس کا ضمیر نیکی اور بدی کے بھنور میں ہچکولے کھانے لگا۔ڈاکٹر کے سلوک سے بدی کا پلڑا بھاری ہوتا رہا۔یہی وہ منحوس چہرہ تھا جس نے گلہ قصائی کی انسانیت کے جذبے پر حیوانیت کا تیشہ چلایا تھا۔ڈاکٹر کو گوشت دیکر اُسے یک گونہ سکون محسوس ہورہا تھا۔وہ ان ہی عجیب وغریب خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ مسجد شریف سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔اللہ اکبر کی صدا سے گلہ قصائی کو ایک جھٹکا سا لگا۔نیکی کا پلڑا بھاری ہونے لگا۔گُلہ قصائی کا ضمیر اسے کوسنے لگا کہ تو صرف قصائی ہے جلاد نہیں۔بیٹی کی ''بابا'' والی آواز پھر سے گُلہ قصائی کے کانوں سے ٹکرائی۔لیکن یہ آواز جلاد سے بدلہ لینے کے لئے نہیں بلکہ بیٹی کی جان بچانے کی آواز تھی۔گُلہ قصائی ننگے پاؤں گاڑی کی طرف دوڑ پڑا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر گوشت کا لفافہ اٹھاتے ہوئے بول پڑا ''یہ بکرے کا گوشت ہے بھیڑ کا نہیں۔''

OOZING WOUNDS

KALE PEDON KA JANGAL BY DR RIAZ TAWHEEDI IS A VALUED ADDITION TO THE LANGUAGE THAT HAS BEEN FORGOTTEN BY ITS OWN PEOPLE.

BOOK REVIEW BY PROFESSOR MUHAMMAD ASLAM

kale pedon ka jangal by Dr Riaz Tawheedi (published by Mezaan Publishers, Srinagar 2011; pp. 103; price ` 200) is a collection of twenty-one short stories written in simple but lucid Urdu. The stories are about Kashmir and on themes which are not unfamiliar to us. The author has taken pains to paint Kashmir and Kashmiri's agony by fictionalizing the reality that we have been witnessing for decades now. The title of the collection might appear abstract but when one goes through the stories, we realize that Dr Tawheedi has used an appropriate expression to highlight the plight and pathos that Kashmiris have gone through endlessly for ages now. The stories are about gruesome killings, mindless killers, the death of communal harmony, the agony that every one has been going through, the loss of honour and dignity etc that all of us are confronted with.

Tawheedi does not talk of Kashmiri Muslims alone. He draws his characters from other communities as well, especially the Sikhs and the Kashmiri Hindus (Pandits). He wails for the loss of

faith in each other; he mourns the death of composite culture and he laments over "what man has made of man" in Kashmir. "Home Land" (page 75) is the story of Kashmir in the nineties when the whole social fabric of Kashmir took an ugly turn in its history and dashed to the ground our age-old communal harmony and mutual trust. The story is about a Pandit family that leaves Kashmir because "our own people have sent us a message that we should leave as early as possible". The main protagonist, Som Nath, doesn't want to leave his birthplace but he can't help: "Even my heart is not ready to leave my birthplace, but when others in the sect left what will I do here alone?" (p. 76-77). Sardar Surjeet Singh and Abdullah Khan request him not to leave, but of no use. Surjeet Singh tries to convince Som Nath that even he was asked to leave but he refused: "We three [Som Nath, Abdullah Khan and Surjit Singh] will brace the coming storm". Nothing could stop Som Nath from leaving the valley for a seemingly peaceful abode. It is only after some years that Abdullah Khan receives a letter from Som Nath which Surjit Singh reads for him. The letter is a tale of woes and hardships that Som Nath has faced: "I made a mistake that on the instigation of others I plunged my family into morass of difficulties. There you respect as well as safeguard our daughters and daughters-in-law! But, here, those who we believed to be our own see our daughters with lustful eyes and disrespect us every where by calling us migrants" (p. 78).

Som Nath's birthplace becomes an "Azad Land" (p. 81) because of the disrespect shown by Som Nath's son towards villagers. Prithvi, an army officer, lays cordon of the village and calls everybody out. He tells the people that they were responsible

for their exodus and they torched their houses. He gives them one month notice to leave the village which was going to be their 'homeland'. Prithvi's talk pains all villagers and when his father's friend Abdullah Khan protests against the false allegations, Prithvi thrashes him with his gun. Seeing this, all villagers give a hue and cry. Among the people is Abdullah Khan's son, Ghaznavi, who faces Prithvi and says, "You people cheated your birthplace and ran away breaking the age old brotherhood. You torched your own houses and sold them to us" (p. 80). Ghaznavi tell Prithvi that their ways are different now and after one month when Prithvi returns to the village, he finds it different from what he had seen earlier—armed men guarding the village and a sign board signaling 'Azad Land'.

"Global Jhoot" (p. 16) is about against the American usage of terrorism that she has been using to hoodwink the entire world. "Gumshuda Sarmaya" (The Lost Wealth) is a pathetic tale of a father who has nobody to look after in his old age (p. 30) when he has spent the entire earning of his life on his children and now he needed help which was not there. He needs one lack rupees as fee for heart surgery which can be done only by Dr Arshad Khan, his son living in America. In sending him there, Gaffar Khan had taken a loan of fifty thousand rupees out of his GP Fund. When the officer asked him what he would keep for himself as he was retiring the next year, Gaffar Khan, had said, "Sir, my real wealth is my children" (p. 32). Dr Arshad did come from America, first, to operate on a minister's son because he had paid two lac rupees in advance. The doctors asked Gaffar Khan to get money but he couldn't. His friend, Rajaz Ali, told him that he would get him

money from Sakhawat Centre. Next day, when Rajab Ali tells him that Dr Arshad had agreed to operate on him. Not only that, he had also given a concession of fifty thousand rupees. This broke Gaffar Khan's heart and he wondered how a human being could turn into a beast in a foreign country (p. 33). Early in the morning, when the hospital employees entered the ward to take Gaffar Khan to the theater, they were sad to find his cold body lying on the bed.

kale pedon ka jangal is full of such tales that make one mourn the sad plight of Kashmir. Dr Towheedi has a good command over the language. His book could be called a valued addition to the language—Urdu—which has long been abandoned by its owners. Kashmir has given it a good space and writers like Towheedi can make it live longer!

Kalay Paedou Ka Jungle

Book Review by Manzoor Ahmad Khan

'Kalay Paedou Ka Jungle' is a collection of twenty one stories featuring multiple themes shared by common people in every changing society. The stories portray different themes including the challenges to social values, social fabric, mutual trust, acceptability, tolerance, humanism etc, which seem changing the definitions and codes with every passing day.

The compilation of stories depicts the onslaught of modernism and modernity and traces the little nuances of old socio-cultural ethos and values. In almost every story, the plot construction is technically rhythmic while the composition is sequential with open narrative account. Presentation is good and proper arrangements of events in time and space while as valid historical information is brought into use to arouse and sustain curiosity among the readers.

Literary tools employed enrich and provide multiple dimensions to these stories as the author, it is very much evident, has taken great pains to be able to provide a vision of occasions in simple and meaningful sequence. Human needs and passions are composed in a natural manner avoiding any artificiality to creep in.

Almost all the stories establish lifelikeness and win readers attention and willingness to accept the world as is portrayed.

Physical and psychological insights essential to the stories are created along with effective mood while as locale and local color tastefully ensure and impart multiple dimensions and authenticity to the stories. Word pictures and strokes are economical and evocative as well.

Information given in the stories reveal atmosphere of pain and deprivation brought out, quite alive, by the minimum use of words highlighting the thwarted expectations of crippled son in 'Maa' (Mother) and the Post Man (who is Father) in Gumshudah Sarmaya (The Lost Wealth) resulting in tension and trauma.

In Safeed Hathi (White elephant), a metaphor of cultural aggression, the author depicts the devastated social fabric, communal harmony, mutual trust etc by suggesting barbaric trample of age old relations based on mutual respect, understanding and brotherhood.

In most of the stories first person narration is opted which adds credibility, immediacy and closeness of life. Narrator, many times, seems lost in the characters perception of the world where reader completely feels proximity of identify with the narrators vision abandoning his own critical intelligence and finally escapes in the characters life. In some stories narrator's perception is limited and one sided as in Safeed Hathi as he blocks the very new aspects, trends and chances of progress and prosperity existent in developed and developing societies.

In other stories third person narration is adopted which provides leisure and choice, to the author, to move back and forth and act as omniscient narrator. Author's prominent choice of figurative language adds meaning and dimension to the stories by

Meezan Publishers & Distributors
Opp. Fire & Emergency Services HQRS Batamaloo
Srinagar-190009 Kashmir
Ph.2470851 \ Fax 0194 2457215 \ Cell: 9419002212 / 8494002212